نگار

قیمت فی کاپی ۸ر

"نگار"
بک ایجنسی
لکھنؤ

تصانیف نیاز فتحپوری

"نگار"
بک ایجنسی
لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے وادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالا اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز حصۂ اول

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء کا بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز (حصۂ دوم)

یہ حصہ پہلے حصہ سے زیادہ ضخیم ہے اور اس میں اکثر مکاتیب نقادی حیثیت رکھتے ہیں وہ حضرات جنھیں شعر و شاعری سے دلچسپی ہے انھیں ان مکاتیب میں بہت سے عجیب و غریب نکات شعری نظر آئیں گے رنگین تحریر اور اسلوب ادا کی دلکشی کا ذکر فضول ہے کیونکہ حضرت نیاز کی اس خصوصیت سے ہر شخص آگاہ ہے۔

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل اسکی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

ترغیبات جنسی (۱)

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ مختصر تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

مجموعۂ استفسار و جواب

ان تینوں جلدوں میں [illegible] نیاز کے استفسار و جواب شامل کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اندازہ بیکار ہے کیونکہ نگار کو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے جو کسی [illegible] نہیں ان تینوں جلدوں میں [illegible] تاریخی و تنقیدی مسائل [illegible] اسکی حیثیت ایک [illegible]

زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دُنیا آج کل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ۔ مشکی قوام۔ الائچی دانہ۔ تیل عطر۔ عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف
قسم کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا
مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے۔

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام "مشکی قوام" ہوڑہ — ٹیلی فون :- ہوڑہ، ۴۵۵

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری۔ ۱۴ ہوڑہ روڈ ہوڑہ

موجودہ ادب سے انتخاب

نظم

بانگ درا ... مجلد --- اقبال - للعہ ۸ر
بال جبریل --- " --- " --- للعہ
ضرب کلیم --- " --- " --- ے
زبور عجم --- " --- " --- للعہ
ارمغان حجاز --- " --- " --- للعہ ۸ر
پس چہ باید معہ مسافر " --- ع ۸ر
پیام شباب --- قاضی نذرالاسلام - عہ ۱۴ر
شعلہ و شبنم --- جوش ملیح آبادی - صہ ر
عرش و فرش --- " --- " --- للعہ ر
حسین اور انقلاب " --- " --- عہ ر
شعرستان --- اختر شیرانی --- عہ ر
وھر کنیں --- احمد ندیم --- عہ ۸ر
الطاف کے گیت --- الطاف مشہدی عہ ۸ر
گلبانگ حیات --- امین حزیں --- ے ر
کفر و ایمان --- بہزاد لکھنوی --- عہ ۸ر
گیت مالا --- صلاح الدین میراجی - ۸ر
تعلقہ - حاجی لقلق عہ ؛ منقار لقلق عہ ۸ر
رنگ بست --- اثر لکھنوی - عہ ۱۲ر
نقش چغتائی --- چغتائی --- عہ ر
مرقع چغتائی --- " --- معہ ۱۷ر

نثر

رحمت اللعالمین، مکمل تین جلد --- قاضی سلیمان - معہ ۱۷ر
مقالات جمال الدین افغانی مترجم سید ایم - ڈی - ایم - اے - ع ۸ر
راہگذر --- عاشق بٹالوی (افسانے) ----- ع ۸ر
پطرس کے مضامین --- پطرس (مزاحیہ) ---- ع ر
مضامین فلک پیما ------ (مزاحیہ) ---- ے ۸ر
کیلے کا چھلکا --- سندباد جہازی (مزاحیہ) --- ع ر
گنجہائے گرانمایہ --- رشید احمد صدیقی ------ ع ر
گفت و شنید - بشیر ہاشمی - ع ؛ گرد و پیش (افسانے) - ے ر
خوفناک دنیا --- سید محمد علی شاہ (اول، دوم) -- ے ۱۲ر
اُردو ادب جنگ عظیم کے بعد --- ڈاکٹر عبداللہ --- ۱۲ر
خار و گل - ایم اسلم للعہ ؛ مزاحیہ ڈرامہ --- خلیل --- ع ر
ٹیپو سلطان - امجد علی عہ ؛ جرم و سزا - باری علیگ - عہ ۱۴ر
جاہ و جلال - تبسم عہ ؛ دروازہ --- کرشن چند ---- ع ر
شب غم - ایم - اسلم ع ؛ کروٹ - منٹو ع ؛ منٹو کے مضامین ع ۸ر
لیلیٰ کے خطوط ---- قاضی عبدالغفار ------ ع ۸ر
اس نے کہا ------ " ------ عہ ۸ر
مجنوں کی ڈائری ---- " ------ ع ر
افسانہ زریں - اسمار طیب حسین عہ ؛ جواب - کرنل مجید ملک عہ ر
شمع ---- اے آر خاتون (ناول) ------ صہ ر
تصویر --- " " " ------ للعہ ر

تاریخ اسلام سید امیر علی شاہ کا مکمل تین جلدوں میں بامحاورہ اور سلیس ترجمہ از باری علیگ فی حصہ عہ ۱۴ر مجلد مکمل ہر سہ حصہ ے ۸ر

نوٹ: مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

اُردو اکاڈیمی لاہور

ماجد دلین کیا ہے ؟
اس کے لئے اسی اشاعت کا صفحہ ۴۶ ملاحظہ ہو

آیندہ سالنامہ کیا ہوگا
اس کے لئے صفحہ ۵ تا ۷ ملاحظہ فرمایئے

نگار

سالانہ چندہ پانچ روپیہ پیشگی

مدیر خصوصی : نیاز فتحپوری

جلد - ۵۰	فہرست مضامین ستمبر سنہ ۱۹۴۶ء	شمار - ۳

ملاحظات ۵

شبلی اپنے خطوں کے آئینہ میں ..... خالد حسن قادری ۹

قدیم سنسکرت لٹریچر ..... ا - ح ۲۰

فراق گورکھپوری کی عشقیہ شاعری ..... ادیس احمد ادیب - ام - اے ۳۰

اردو ادب میں طنز و مزاح ..... اشعر ملیح آبادی ۳۸

ماجد دلین کیا ہے ۴۶

باہمی مسئلہ و المناظرہ ..... فراق گورکھپوری ۴۹

مالہ و ماعلیہ ۵۴

برکھارت (نظم) ..... پروفیسر شور ——— غزل ..... عرشی بھوپالی ۵۶

تین کی باتیں (نظم) ..... نشور واحدی ۵۷

قطعے (نظم) ..... احمد ندیم قاسمی ——— غزل ..... قمر ہاشمی ٹونکی ۵۸

برسات (نظم) ..... سلیمان اریب ——— کلام اسعد شاہجہاں پوری ۵۹

مطبوعات موصولہ ۶۰

۲۰ر اگست سنہ ۱۹۴۶ء - ۶ ½ بجے شام

فلوکان مابی بالصُخور لہدّ ہا — جو مجھ پر گزری ہے وہ اگر پہاڑوں پر گزرتی تو ریزہ ریزہ ہو جاتے

وبالریح ماہبت وطال خفوتہا — اور اگر ہواؤں پر گزرتی تو وہ چلنا چھوڑ دیتیں

فصبراً لعل اللہ یجمع بیننا — لیکن صبر کرتا ہوں اس امید پر کہ شاید ہم تم پھر کبھی یکجا ہوں، اسوقت

فاشکو ہموما منک فیک لقیتہا — میں شکایت کرونگا کہ مجھے تنہا چھوڑ کر تم کتنی اذیتوں میں مبتلا کر گئیں

حالت لبُعدکم ایامنا فغدت — تمھاری جُدائی سے یہ حال ہے کہ اب میرے دن بھی تاریک ہیں

سُوداً وکانت بکم بیضا لیالینا — حالانکہ جب تم تھیں تو میری راتیں بھی روشن تھیں

بالامس کنا وما یخشیٰ تفرقنا — ایک دن کل تھا کہ تم سے چُھٹنے کا کوئی اندیشہ ہی نہ تھا

والیوم نحن وما یُرجیٰ تلاقینا — اور ایک دن آج ہے کہ تم سے ملنے کی کوئی امید نہیں

آہ ——!

غم نصیب
نیاز

ملاحظات

آیندہ سالنامہ

میں چند ماہ سے سوچ رہا تھا کہ آیندہ سالنامہ کیا ہو اور جوبلی نمبر اگر مرتب نہ ہو سکے تو پھر کونسی ایسی چیز پیش کی جائے جو اس کا صحیح بدل ہو سکے۔

جوبلی نمبر کی اشاعت تو فی الحال ممکن نہیں، کیونکہ اس کی ترتیب کے لئے بھی کم از کم چھ ماہ کی ضرورت ہے اور اسی کے ساتھ پورے اطمینان و سکون کی جو بدقسمتی سے آجکل مجھے بالکل میسر نہیں۔ علاوہ بریں اسکے لئے جتنے کاغذ کی ضرورت ہوتی وہ بھی اس وقت فراہم نہیں ہو سکتا، کیونکہ کاغذ کا موجودہ کوٹا معمولی اشاعتوں کے لئے بھی کافی نہیں ہوتا چہ جائیکہ جوبلی نمبر کے لئے جو کم سے کم ۳۰۰ صفحات پر محیط ہوتا۔

اس وقت تک نگار کے جتنے سالنامے شایع ہوئے ہیں، وہ زیادہ تر ادب و نقد سے تعلق رکھتے تھے، لیکن خالص "ادب لطیف" نہ تھے اور اس وقت تک میں نے قصداً اس رنگ کا سالنامہ اس لئے شایع نہیں کیا کہ رسالوں کے "افسانہ نمبر" عام طور پر نکلتے ہی رہتے ہیں اور میں شاید اس میں کوئی خاص اضافہ نہ کر سکوں گا۔ لیکن اب ایک صورت ایسی سامنے ہے جس سے آپ کا ادبی ذوق بھی پوری طرح آسودہ ہو سکے گا اور میں بھی اپنی جگہ یہ سمجھکر مطمئن ہو سکوں گا کہ جوبلی نمبر سے بہتر ایک چیز آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

چند ماہ سے ماجدولین کا اعلان آپ کی نگاہ سے گزر رہا ہوگا، اس کے متعلق پہلے یہ خیال تھا کہ اسکو کتابی صورت میں پیش کیا جائے اور تجارتی نقطۂ نظر سے یہی بہتر ہوتا، لیکن چونکہ اس میں تعویق ہوتی، اس لئے بعد کو میں نے سوچا کہ اسے بالاقساط نگار میں شایع کر دوں اور یہ فیصلہ میں نے بدرجۂ مجبوری کیا تھا، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایسی چیز نہیں کہ لوگ زیادہ تاب انتظار لا سکیں اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے شایع کرنے سے اس کے سارے لطف کو برباد کر دینا ہے۔ اس لئے سب سے بہتر صورت یہی نظر آئی کہ پورا افسانہ سالنامہ میں شایع کر دیا جائے اور اس طرح باوجود افسانہ نمبر ہونے کے بھی نگار کا یہ خاص نمبر دوسرے رسالوں کے افسانہ نمبروں سے ممیز ہو سکے۔

ماجدولین دراصل نہ کوئی افسانہ ہے نہ ناول، بلکہ حقیقی داستان ہے ایک دردمند دل کی، آپ بیتی ہے ایک بدنصیب آرٹسٹ کی۔ اس کی بنیاد کسی فرضی پلاٹ پر قایم نہیں ہے، بلکہ اس کی تعمیر اُن دل کے ٹکڑوں سے ہوئی ہے جن کے نشانات و آثار سرزمین جرمنی میں اب بھی موجود ہیں۔

ماجدولین، ادبی حیثیت سے کتنی بلند چیز ہے اس کا اندازہ آپ کو اس ایک خط سے ہوگا جو اسی

اشاعت میں کسی جگہ اس سے نقل کیا گیا ہے، یہ ایسی المناک داستان ہے جس کی ترتیب میں معلوم نہیں کتنے تیر و نشتر سے کام لیا گیا ہے اور کسے خبر ہے کہ وہ کتنا خراج اشک آپ سے وصول کرے گی۔

اس داستان میں جس تدریج کے ساتھ ٹریجڈی کو اس کے انتہائی عروج (climax) تک پہونچایا گیا ہے وہ بالکل ایسی ہی چیز ہے جیسے خنجر کو نہایت آہستہ آہستہ سینہ میں پیوست کیا جائے یا ایک چراغ کی روشنی تھوڑی تھوڑی ہو کر صبح کو دفعتاً گل ہو جائے۔ جذبات و تخیل کے لحاظ سے یہ اتنی اچھوتی اور نادر چیز ہے کہ مغربی لٹریچر میں بھی شاید ہی کوئی دوسری مثال ایسی پیش کی جا سکے۔ اور افادی حیثیت سے یہ ایسا پاکیزہ و بلند شاہکار ادب ہے کہ عورتوں، لڑکیوں اور نوجوانوں کے لئے اگر اسے "انجیل اخلاق" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس میں فطرت انسانی، نظریۂ محبت و ازدواج، فلسفۂ لذت و الم اور آرٹ کے بلند نصب العین کو نفسیاتی تجزیہ کے ساتھ ساتھ جس طرح پیش کیا گیا ہے اس کا صحیح اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

الغرض ماجدولین دنیائے ادب میں ایک ایسی اختراع فایقہ ہے جسے سحر و افسوں کہنا زیادہ موزوں ہوگا اور اسی کو ہم آیندہ سالنامہ میں مکمل شایع کر دینا چاہتے ہیں۔

اگر ہم اسے کتابی صورت میں شایع کرتے تو اس کا حجم کسی طرح ۳۰۰ صفحات سے کم نہ ہوتا اور اس کی قیمت کم از کم چار روپیہ ہوتی، لیکن نگار کے موجودہ مسطر پر بھی اس کا حجم کافی ہو جائے گا، اور ہم کو غیر معمولی مصارف برداشت کرنا ہوں گے۔ ان مصارف کے پورا کرنے کی تدبیر یہ سوچی گئی ہے کہ:-

اس سالنامہ کے لئے علاوہ سالانہ چندہ کے ایک روپیہ زاید طلب کیا جائے۔ اس لئے جن حضرات کا چندہ آیندہ دسمبر میں ختم ہو رہا ہے انکے نام سالنامہ کا وی پی بجائے پانچر روپیہ چار آنے کے چھ روپیہ چار آنے میں بھیجا جائے گا اور جن کا چندہ دسمبر میں ختم نہیں ہوتا ان کے نام ایک روپیہ چار آنہ کا وی پی جائے گا۔

یہ بالکل طے شدہ امر ہے کہ اس سالنامہ کو بغیر رجسٹری کے یوں نہ بھیجا جائے گا، کیونکہ اسکا کثیر تعداد میں گم ہونا یا سرقہ ہو جانا بالکل یقینی ہے اور ہم دوبارہ اس کو مفت فراہم نہیں کر سکتے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ دوران جنگ میں اکثر رسایل نے اپنی قیمتوں میں اضافہ کردیا لیکن نگار نے کوئی اضافہ نہیں کیا، اور اب بھی ہم کوئی اضافہ نہیں کر رہے بلکہ صرف ۱۹۴۷ء کے لئے ہم ایک روپیہ زاید طلب کر رہے ہیں اور اس کے عوض میں ہم آپ کو ایسی بے مثل کتاب دے رہے ہیں جو یوں کسی طرح چار روپیہ سے کم میں آپ حاصل نہ کرسکتے۔

ہمیں امید ہے کہ قائمین نگار اس تجویز سے اتفاق کریں گے اور اگر کسی صاحب کو ایک روپیہ زاید دینا منظور نہ ہو تو ازراہ کرم ہمیں مطلع کردیں۔

عبوری دور کی حکومت

۲ ستمبر سے ہندوستان کی تاریخ کا وہ باب شروع ہوتا ہے، جسکی عرصہ سے تمنائیں کی جارہی تھیں اور جس کے لئے ملک نے عظیم الشان قربانیاں پیش کیں، لیکن باایں ہمہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آزادی حقیقی حاصل ہوگئی ہے۔ کیونکہ آزادی کا صحیح مفہوم اسی وقت ہوسکتا ہے جب اجنبی درخور سے ملک بالکل آزاد ہو اور امن وسکون کی فضا پیدا ہوجائے اور بدقسمتی سے ابھی تک یہ دونوں باتیں حاصل نہیں ہوئیں۔

یقیناً لطف کی بات یہ تھی کہ آج ہند کی حکومت (خواہ وہ عارضی ہو یا مستقل) ایک ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہوتی جو بجا طور پر اپنے آپ کو تمام طبقات کا نمایندہ کہہ سکتی، لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوسکا اور ملک کی فضا پہلے سے زیادہ مکدر نظر آرہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کیبنٹ مشن نے پوری کوشش کی کہ وہ متحدہ ہندوستان کی متحدہ حکومت یہاں قایم کرسکیں، لیکن خود ہماری باہمی مخالفتوں نے جن کی بنیاد، مذہب، اقتصاد اور کلچر پر قایم ہے، یہ صورت پیدا نہ ہونے دی اور بار بار اس نے اپنے فیصلہ کے مفہوم کی تعیین میں کچھ ایسے بیانات دئے، جن سے معلوم ہوتا تھا کہ خود اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ان حالات میں کیا کرے۔

جس وقت کانگرس نے عارضی حکومت کی پیشکش کو رد کردیا تھا تو مسلم لیگ کو وایسرائے کے بیان کے مطابق یہ توقع قایم ہوگئی تھی کہ عنان حکومت اب اس کے ہاتھ میں دیدیجائے گی، لیکن بعد کو پھر ہوا کا رخ پلٹا اور کانگرس نے شرکت وتعاون کا ارادہ ظاہر کرکے وایسرائے کے قدم پھر ڈگمگادئے۔ لیکن اس باب میں ہم نہ وایسرائے کو قابل الزام قرار دے سکتے ہیں نہ کانگرس کو، کیونکہ ایسے اہم سیاسی معاملات میں رایوں کا بدلتے رہنا بالکل قدرتی امر ہے اور کسی فریق کا ان کو سامنے رکھکر، رد وقبول کا کوئی نظریہ قایم کرنا درست نہیں۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ مسلم لیگ کی شکایت ایک حد تک بالکل بجا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس کی یہ ضد کہ وہ کانگرس کے ساتھ کام کرنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوسکتی یقیناً بچوں کی سی ہٹ ہے۔ وایسرائے نے جس وقت

کانگرس کو عارضی حکومت سنبھالنے کی دعوت دی، اسی وقت نہایت محبت و وثوق کے ساتھ مسلم لیگ سے بھی شرکت و تعاون کی درخواست کی اور اگر واقعی مسلم لیگ کے دل میں آزادی ملک کی صحیح لگن لگی ہوتی، تو وہ اسوقت ولیسرائے کی غلطی یا فروگزاشت کو بھی پس پشت ڈال دیتی اور کانگرس کے ساتھ کام کرنے پر راضی ہو جاتی، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور اس کا نتیجہ نہ صرف یہ ہوا کہ پورے ملک کی نمایندگی سے عارضی حکومت محروم ہو گئی، بلکہ فضا زیادہ مکدر ہو گئی اور اگر کلکتہ کا فساد واقعی اسی تکدر فضا کا نتیجہ تھا، تو ہندوستان کو شرم آنا چاہئے کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ ایک طرف آزادی وطن کا نعرہ بلند کیا جا رہا تھا، دوسری طرف آزادی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جا رہا تھا۔

کلکتہ میں جو کچھ انسانی ہاتھوں نے کیا، اس کے بیان کرنے کے لئے انسانی زبان بالکل قاصر ہے اور اس وقت تک وہاں کے جو حالات سننے میں آئے ہیں، وہ ایسے دردانگیز ہیں کہ ہم کسی طرح باور نہیں کر سکتے کہ انسان اس درجہ بیرحم ہو سکتا ہے — ہم یہ نہیں کہتے کہ کلکتہ کے اس خونیں فساد کی ذمہ دار تنہا مسلم لیگ ہے اور نہ یہ کہ مسٹر سہروردی بنگال کے وزیر اعظم اس کا باعث تھے، کیونکہ ہم جانتے ہیں مسٹر سہروردی اس قدر بیوقوف نہیں ہو سکتے کہ وہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ اس طرح مسلمانوں کا بھی کم نقصان نہ ہوگا، لیکن حکومت بنگال اس الزام سے اپنے آپ کو بہ مشکل بری کر سکتی ہے کہ اس نے نہ فساد کے روکنے کی معقول کوشش کی اور نہ اس کو فرو کرنے کی — بہرحال وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہوا اور ہو سکتا ہے کہ کم و بیش اسی طرح کے واقعات کچھ عرصہ تک رونما ہوتے رہیں، لیکن وہ وقت بھی یقیناً آ کر رہے گا، جب ہندو مسلمان یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ آخر کار انھیں ملکر رہنا ہے اور ملک اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس اختلاف کو دور نہ کریں، اور اگر مسلم لیگ ہی نے اس طرف پیشقدمی کی (خواہ اس کے لئے اس کو اپنی خودداری ہی کیوں نہ ترک کرنا پڑے) اور عارضی حکومت میں شرکت کو منظور کر لیا جس کے دروازے اب بھی اس کے لئے کھلے ہوئے ہیں، تو یہ اس کا اتنا بڑا کارنامہ ہوگا کہ غالباً ہندو بھی اس کے اس عظیم الشان احسان رواداری کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

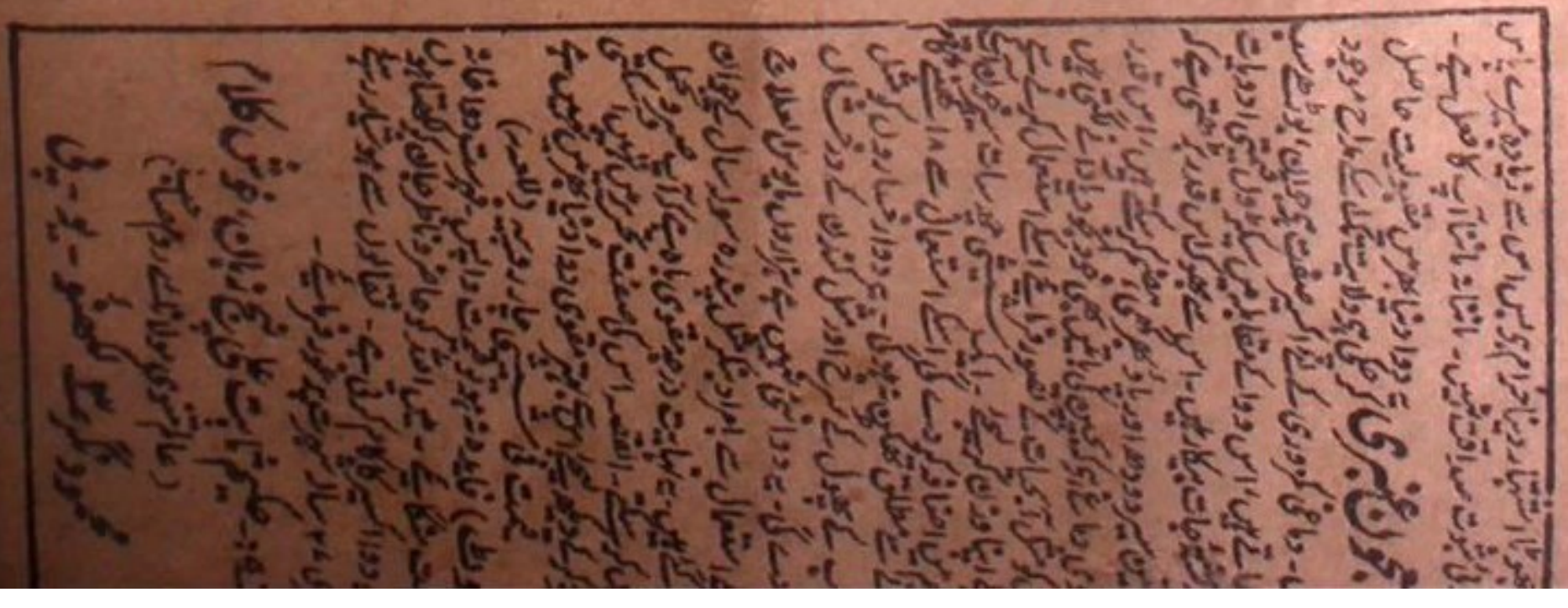

شبلی اپنے خطوں کے آئینہ میں

(بہ سلسلۂ ماسبق)

وہ چاہتے تھے کہ ہر طالب علم بجائے کٹھ ملا بننے کے ایک سچا مسلمان اور صحیح انسان بن جائے۔ یہ خواہش آہستہ آہستہ قلب کے خاموش گوشوں میں بیدار ہوئی اور کچھ ہی عرصہ میں ایک مستقل نظریہ بن گئی۔ اور شبلی نے ندوۃ العلماء میں شرکت کی۔ اور آیندہ اپنی زندگی کی تمام مسرتیں اس مذہبی اور قومی خدمت پر نثار کر دیں۔ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کو لکھتے ہیں:۔ "اب کے بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں۔ لیکن عین عالم لطف میں ندوہ کی فوری ضرورت سے یہاں آنا پڑا۔ لیکن آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے۔ خیر اس پر فخر کرتا ہوں کہ دل کی خواہش کو قوم اور مذہب پر نثار کر سکتا ہوں۔ اور بے تکلف کر سکتا ہوں۔"

قوم کا سچا درد، اس کی اصلاح کا صحیح جذبہ شبلی کی رگ رگ میں تیر گیا تھا۔ ان کے خطوں سے صاف جھلکتا ہے کہ وہ قوم کی مصیبت کا رونا اور اس کی اصلاحوں پر لکچر اور قومی تنزل و ترقی پر مسدس لکھنے والوں میں نہ تھے۔ بلکہ وہ ایک نصب العین سامنے رکھ کر بے پناہ اور ان تھک کوششوں کے ساتھ مسلسل کام کرنے والوں میں تھے اور اسکا سبق انھوں نے سرسید سے سیکھا تھا۔

فیضی بہنوں سے ان کی وابستگی مسلّم ہے۔ وہ عطیہ اور زہرا کے خطوں میں بار بار اس تمنا کا اظہار کرتے ہیں کہ بمبئی کو اپنا مستقر بنالیں یا جنجیرہ اور بمبئی میں عرصۂ دراز تک قیام کریں۔ اور اگر وہ ایسا کرتے تو کوئی چیز مانع نہ ہو سکتی تھی ادبی خدمت اور تصنیف و تالیف کا کام وہ ندوہ سے الگ رہ کر بھی کر سکتے تھے اور نفسیاتی اعتبار سے فیضی خاندان میں رہ کر زیادہ سکون و طمانیت کے ساتھ کر سکتے تھے۔ لیکن ایک قومی کام اور ایک مذہبی خدمت کو جو انھوں نے اپنے متعلق کر لی تھی کسی قسم کا ذرا سا بھی نقصان پہونچانا انھیں گوارا نہ تھا۔ وہ ہر راحت تج سکتے تھے، ہر عیش ترک کرنا ممکن تھا ہر آرام چھوڑ سکتے تھے لیکن قوم و مذہب کا ایک درد جو ان کے دل میں سما گیا تھا اس کو نکالنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ہر چند ندوہ کی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیتوں نے ان کی صحت پر مضر اثرات بھی ڈالے۔ ذہنی انتشار اور دماغی پریشانی بھی لگی رہتی تھی۔ مولانا حبیب الرحمان خاں صاحب شروانی کو لکھتے ہیں — "..... لیکن بدقسمتی دیکھئے

کہ ندوہ کے ہنگامہ کاموں نے دماغ کو اس قدر ابتر کر دیا ہے کہ ایسے موقع سے بھی فایدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ نہ وقت نہ دماغ۔ حسرت کا بھی اس سے بڑھ کر منظر دنیا نے نہ دیکھا ہوگا۔" لیکن باوجود اس پریشانی تکلیف اور کوفت کے انھوں نے ہمت نہ ہاری اور ندوہ کو اسلامی دارالعلوم بنا کر چھوڑا۔ عطیہ بیگم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "افسوس دیر تک جینے کی امید نہیں میں وطن، احباب، آرام سب چھوڑ سکتا ہوں لیکن ایک مذہبی اور قومی کام کیونکر چھوڑ دوں۔"

ایک مرتبہ عطیہ بیگم نے شبلی کو کم ہمتی کا طعنہ دیا۔ اس پر لکھتے ہیں:۔ تم کہتی ہو کہ میں 'بدہمت' ہوں۔ میری زندگی کے دو حصے ہیں۔ پرائیویٹ اور پبلک۔ اگر پبلک کام میرے کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو تم میری ہمت کا اندازہ کر سکتیں۔ تم کو کیا معلوم ہے کہ میں اگر عوام کی مرضی کا کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک نہایت مفید تحریک فوراً برباد ہو جائے گی۔ خیر یہ بار بار کہنے کی بات نہیں۔ اس سے فخر کی بو آتی ہے اور میں اس کو ناپسند کرتا ہوں۔"

شبلی کے خط پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کے خاموش کام کرنے والوں میں تھے جو ایک مفید کام کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیتے ہیں۔ صلے کی پروا اور ستایش کی تمنا سے بے نیاز ہو کر کام کرتے ہیں اور آخر میں ایک مستقل اور ٹھوس کام کر گزرتے ہیں۔ حیات شبلی کا یہ تابناک پہلو قوم کے تعمیری کام کرنے والوں کے لئے نشان راہ کا کام دے سکتا ہے۔

اب رہی فیضی بہنوں کے ساتھ شبلی کی دلبستگی۔ جسے اکثر لوگ ان کی حیات معاشقہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہمیں اس امر میں بھی دوسروں سے شاید اختلاف ہے۔ اس دلبستگی کو بھی ایک دوسرے انداز سے دیکھنا چاہئے۔

ہر ادیب اور سچے شاعر کا ایک خاص معیار نظر ہوتا ہے۔ اس کے تخیل میں ایک خاص آئیڈیل ہوتا ہے وہ خصوصیات اور وہ خوبیاں جن سے وہ اپنے آئیڈیل کو متصف کرتا ہے اس عالم رنگ و بو میں اس کو کسی ایک شخصیت میں مجتمع نظر نہیں آتیں۔ وہ جہاں جہاں اور جس جس میں وہ خصوصیات پاتا ہے ان کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ خواہ ان چیزوں میں ظاہری اعتبار سے آپس میں کتنا ہی تضاد کیوں نہ ہو لیکن اس کی نگاہ ان سب کے اندر ایک قسم کی ہم آہنگی ڈھونڈھ لیتی ہے اور اس اعتبار سے کہ مختلف چیزوں میں اس کے آئیڈیل کی مختلف خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ ان سب کی تعریف کرتا ہے۔ اب اگر اتفاق سے وہ چیزیں آپس میں مختلف النوع اور متضاد بھی ہوں تب بھی اس شاعر و ادیب پر تضاد خیالات کا الزام عاید نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ان چیزوں کی بحیثیت مجموعی تعریف کرتا ہے نہ بذات خود ان کو مکمل سمجھتا ہے اور نہ ان کو مقصود بالذات جانتا ہے۔ بلکہ وہ ان کی صرف اتنی ہی تعریف کرتا ہے اور اسی اعتبار سے مستحسن سمجھتا ہے جتنی وہ اس کے اپنے آئیڈیل سے قریب تر ہوتی ہیں۔

شبلی ایک زبردست ادیب و انشاء پرداز تو تھے ہی۔ ان کے نقاد و شاعر ہونے میں بھی شبہ نہیں۔ اسکے

ساتھ ہی اسلام کی زریں تاریخ کا ایک ایک صفحہ ان کے سامنے روشن تھا۔ اسلامی تاریخ کا ہر ہر پہلو اور ہر واقعہ ان کے سامنے تھا۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ قرونِ اولیٰ میں کیسی کیسی عالم و فاضل، زبردست انشا پرداز، بے نظیر مقرر اور بے مثل ادیب خواتین پیدا ہو چکی ہیں۔ انھوں نے مسلمان بیبیوں کی شجاعت و دلیری کے واقعات بھی دیکھے تھے۔ پھر اور ذرا بعد کے زمانہ کی ایسی پاک بیبیاں بھی یاد تھیں جنھوں نے خانہ داری و سلطنت کے کام بیک وقت انجام دئے ہیں۔ وہ مسلمان بیبیاں بھی ان کی نظر میں تھیں جن کی سیاسی قابلیت تدبر اور تفکر نے ایک عالم کو محوِ حیرت کر دیا تھا۔ غرض تعلیم اسلام کے مطالعہ نے ان کے ذہن پر مسلمان عورت کا ایک بالکل صحیح نقش قایم کر دیا تھا۔ اور ان کے تخیل میں عورت کا ایک ایسا آئیڈل موجود تھا کہ وہ ہر مسلمان عورت کو ویسا ہی بنانا چاہتے تھے۔ اس زمانہ کے شدید مذہبی عقاید اور کٹھ ملاؤں کی تنگ نظری نے مسلمان عورت کی سماجی حیثیت بمنزلہ صفر کر رکھی تھی۔ فیضی خاندان بمبئی کا ایک نہایت روشن خیال اعلیٰ دماغ خاندان تھا۔ تمام خواتین تعلیم یافتہ تھیں۔ عطیہ بیگم نے بالخصوص بہت اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ اس صفت اضافی کے علاوہ ان میں ایسے جوہر ذاتی بھی موجود تھے جن کو ذرا سی جلا دیکر مسلمان عورتوں کے لئے ایک معیار بنایا جا سکتا تھا۔ شبلی نے عطیہ کے اندر اپنے آئیڈل کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ ان کو ایک نمونہ بنا دینا چاہتے تھے۔ یہی خیالات کی ہم آہنگی تھی جس نے شبلی کو ان کا گرویدہ بنا دیا۔

عطیہ بیگم صاحبِ قلم تھیں۔ اُردو میں بھی لکھتی تھیں۔ انگریزی کی تو زبردست انشا پرداز تھیں۔ شبلی ایک مضمون کے متعلق لکھتے ہیں:۔ "تمھارے مضمون کا ترجمہ خاتون میں نکلا کچھ خوب سمجھ میں نہیں آیا۔ تم خود اُردو میں کیوں نہ لکھو۔ یہ خیال غلط ہے کہ تم اُردو میں عاجز ہو۔ عطیہ خویشتن را بشناس!"

زہرا بیگم کو لکھتے ہیں:۔ "آپ کو رہنمائی کی کیا ضرورت ہے آپ اور عطیہ جیسی اُردو لکھ لیتی ہیں کاش ہمارے صوبہ بھر میں کوئی خاتون لکھ سکتی"۔

زہرا بیگم کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔ "عنایت نامہ عین اسوقت پہونچا جب میں حیدر آباد روانہ ہو رہا تھا۔ اور احباب کا ایک مجمع کثیر میرے رخصت کرنے کو جمع تھا۔ ان میں مسٹر شرر اور مولوی عزیز مرزا صاحب ہوم سکریٹری بھی تھے۔ آپ کا خط میں نے استعجاباً سنایا اور لوگوں نے آپ کی انشا پردازی کی متحیر ہو کر داد دی"۔

عطیہ کو لکھتے ہیں:۔ اب تو تمھارے خطوط ایسے ہوتے ہیں کہ احباب کو مزے لے لے کر سناتا ہوں اور لوگ سر دھنتے ہیں۔ پالی ٹیکس کے متعلق تمھارے پچھلے خط کے اقتباسات (کوٹیشن) میں نے حیدر آباد اور الہ آباد بھیجے"

غرض شبلی ان دونوں بہنوں اور بالخصوص عطیہ کو ایک نمونہ بنا دینا چاہتے تھے۔ ان کی غلطیوں پر بار بار ان کو ٹوکتے۔ غلط محاوروں کو بتاتے۔ ان کا نازک فرق صحیح استعمال بتاتے۔ عطیہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "تم خود شعر نہیں کہتیں لیکن شعر کہنے سے شعر سمجھنا زیادہ مشکل ہے اور یہ وصف تم میں موجود ہے۔۔۔۔ چٹکیوں میں اڑا تی ہیں"

رکیک محاورہ ہے اور جس موقع پر تم نے لکھا ہے اس کے لئے بالکل خلاف تہذیب ہے۔ یہ محاورہ سرے سے کبھی نہ لکھا کرو۔

میں تم کو بار بار ٹوکتا ہوں ممکن ہے کہ تم کو گراں گزرے۔ لیکن جی نہیں مانتا کہ تمہاری اُردو کے روشن چہرہ پر داغ باقی رہ جائیں۔ بس دو چار۔ بار کی اور کسر ہے۔"

اسی طرح اپنے تمام خطوں میں برابر دونوں بہنوں کو ان کی غلطیوں پر ٹوکتے رہتے ہیں۔ عطیہ جب یورپ سے لوٹیں تو ان کو لکھتے ہیں:۔ "معاف کرو یورپ جا کر انگریزی میں تم نے ترقی کی لیکن اُردو زبان بگاڑ لائیں۔ احسان مانتی ہوں۔ فائدہ لیتی ہوں۔ بہت تجویز ہوا۔ یہ سب محاورے نہایت غلط اور عوام دکن کی زبان ہیں۔"

عطیہ بیگم نے اپنے خاندان میں ادبی ترقی کے لئے خاندان کی لڑکیوں کی ایک سوسائٹی "عقد ثریا" قایم کی تھی جس میں مضامین پڑھے جاتے اور تقریریں ہوتیں۔ شبلی چاہتے تھے کہ عطیہ کو فطرت نے جو تقریر کا ملکہ دیا ہے وہ اس کو اور جلا دیں اور ایک بہترین مقرر ہو جائیں۔ لکھتے ہیں:۔ "آپ کی عبارت میں بعض محاورے بمبئی کے مخصوص ہیں آیندہ بچئے مثلاً یہ لفظ کتابیں برابر مل گئیں، برابر ملنا غلط ہے۔ بہن کا مال ان کو دیدیا۔ مال کا لفظ ایسی چیزوں کے متعلق نہیں بولتے یہ لکھنا چاہیئے تھا کہ ان کی چیزیں ان کو دیدیں۔ میری اسکیم یا تجویز جو آپ کے متعلق ہے وہ یورپ سے آنے کے بعد قابل اظہار ہوگی۔ یعنی میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مشہور عورتوں کی طرح لیکچرار اور اسپیکر ہو جائیں جو انگریز اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں۔ لیکن اُردو میں تاکہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں۔ آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہے صرف مشق کی ضرورت ہے۔" پھر ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔ "اُردو تقریر میں اصل مضمون سے زیادہ طرز ادا کی خوبی کا لحاظ ہونا چاہیئے۔ بمبئی کے جلسہ میں مسز نائیڈو اگرچہ نہایت عمدہ بولیں ڈلیوری بھی اچھی تھی۔ لیکن تصویر کی طرح غیر متحرک رہیں۔ تقریر میں تمام اعضاء کو زبان کا ساتھ دینا چاہیئے۔

شبلی نے عطیہ بیگم کے واسطے ایک مکمل لائحہ عمل طیار کیا تھا۔ عطیہ کو لکھتے ہیں:۔ "خط جو ضایع ہو گیا اس میں تم سے ایک پرائیوٹ بات پوچھنا چاہتا تھا۔ یعنی یہ کہ تم نے اپنی زندگی کا ایم (مقصد) کیا قرار دیا ہے۔ کیا ریفارمیشن یا اشاعت تعلیم یا تصنیف و مضمون نگاری ان میں سے پہلے مقصد کے سوائے جس کا میں اہل نہیں ہوں باقی تمہارے مقصد میں تم کو کافی مدد دے سکتا ہوں۔"

عطیہ بیگم فارسی زبان سے اچھی طرح واقف تھیں۔ لیکن واقفیت اور مہارت میں بڑا فرق ہے۔ شبلی چاہتے تھے کہ عطیہ کو فارسی زبان و ادب کا عالم بنا دیں۔ چنانچہ اکثر خطوں میں اس خواہش کا اظہار کیا ہے اور اپنے خطوں میں فارسی اشعار کی تشریح اور علم و ادب کے نکتے تحریر کئے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔ "عطیہ بیگم! تجھ کو معلوم نہیں کہ اب کب ملنے کا اتفاق ہو سکتا ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اگر یہ موقع پھر ملا تو میں چاہوں گا کہ تمہاری کچھ علمی خدمت

کرسکوں۔ تم کو فارسی پڑھاؤں اور اُردو کی انشاپردازی سکھاؤں۔ تم اس کو اپنی تحقیر تو نہ خیال کروگی؟" ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔ "بارہا جی چاہتا ہے کہ تم کو اس طرح فارسی پڑھاؤں کہ فارسی شاعری اور فارسی زبان کا ایک ایک نکتہ ذہن میں آجائے۔ تاج گنج کی صناعیوں سے ایک گنوار بھی لطف اُٹھاتا ہے۔ لیکن وہ بات حاصل نہیں ہوسکتی جو ایک انجنیر اور ماہر فن کو ہوتی ہے۔ 'بوئے گل' بھی اگر تم سمجھ کر پڑھ لو تو فارسی لٹریچر کی ادائیں کسی قدر معلوم ہوسکتی ہیں۔"

کلکتہ سے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "فارسی آموزی کا ذکر بارہا ہو چکا ہے۔ لیکن محض آرزو اور تمنا سے کیا حاصل۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ کبھی کبھی کوئی بات لکھدیا کروں۔ سب جمع ہوجائیں گی تو ایک اچھا خاصہ سلسلہ منضبط ہوجائے گا، سب سے پہلا مرحلہ زبان کا ہے۔ یعنی زبان محاورہ اور روزمرہ سے مزہ لینا اور لطف اُٹھانا شرط ہے۔ مثلاً خواجہ حافظ کا یہ مصرعہ:۔ "واں شوخ دیدہ ہیں کہ سراز خواب برنہ کرد" اس مصرعہ کے لفظی معنی صرف اسقدر ہیں کہ اس شوخ دیدہ نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اب تم نے قرینہ سے اس مصرعہ کا مفہوم سمجھ لیا یا قیاس کرلیا کہ سراز خواب برنہ کردن کے معنی نہ جاگنے کے ہیں۔ تو اس سے کچھ فایدہ نہیں۔ معنی سمجھ لینا اور چیز ہے اور لطف اُٹھانا اور چیز ہے۔ گانا سب سنتے ہیں اور معمولی طور سے سمجھ بھی لیتے ہیں۔ لیکن جو شخص گانا سن کر بیتاب ہوجاتا ہے اور تڑپ جاتا ہے اصل میں گانا اس کے لئے ہے۔ یہ بات زیادہ مشق اور زیادہ مصروفیت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مثلاً خواجہ حافظ کے اشعار میں جہاں جہاں زبان اور محاورہ ہے ان پر کوئی شخص نشان کردے۔ ان کو تم پڑھو اور بار بار پڑھو (معنی سمجھ کر) رفتہ رفتہ ایک خاص لذت پیدا ہونی شروع ہوگی۔ جس طرح کسی نشہ اور معجون سے ہوتی ہے اور اس وقت معلوم ہوگا کہ تمہارے اندر ایک حاسہ اور بڑھ گیا۔ مثلاً داغ کا یہ شعر:

بات کرنی بھی نہ آتی تھی تمھیں ۔۔۔ یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

ممکن ہے کہ اس شعر اور محاورہ کو ہر شخص سمجھ لے۔ لیکن جس شخص کو اُردو زبان کا چسکا اور ذوق ہے وہ اس محاورہ پر تڑپ اُٹھے گا۔ اس بنا پر تم کو بھی پہلے اسٹڈی زبان فارسی کی کرنا چاہیئے اس کے بعد مضامین اور خیالات کا نمبر ہے۔"

شبلی کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کی فرسودہ اور پامال روش سے ہٹ کر چلنے کے عادی تھے۔ ان کے خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے لحاظ سے بہت بڑے ترقی پسند تھے۔ کاش کہ وہ باغی بھی ہوتے! اُس زمانہ میں جب کہ مسلمان عورت کے لئے ذرا سی بھی روادارئ برتنے کے قائل نہ تھے اور اس کی خدا ہی بھی آزادی ان کی آنکھ میں کھٹکتی تھی، جب کٹھ ملا کفر کے فتوے ہمہ وقت بغل میں دبائے مصلحین وقت کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے وہ اس قسم کے خیالات رکھتے تھے جنھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان میں ایک مصلح کا دل ضرور تھا لیکن ایک باغی کی روح نہ تھی۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار چپکے چپکے کرتے ہیں۔ عوام کے سامنے نہیں

اپنی تصانیف میں نہیں بلکہ پرائیویٹ خطوں میں وہ ڈرتے ہوئے کہتے ہیں اور پھر کہکر ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی فتنہ کھڑا نہ ہوجائے، ایک مجاہد کی طرح بگیر و بزن کہکر میدان میں آکر سماج کے مفروضات کہنہ اور عقائد باطلہ پر ایک کاری ضرب نہیں لگاتے۔

وہ عطیہ کے نام سے بورڈنگ ہاؤس میں ایک کمرہ بنوانا چاہتے تھے، ان کے نام اپنی کوئی تصنیف ڈیڈیکیٹ کرنا چاہتے تھے مگر ان میں سے کچھ بھی وہ محض عوام کی برہمی کے خیال سے نہ کرسکے۔ عطیہ ندوہ کے ایک جلسہ میں آنا چاہتی تھیں، مولانا بہ دل چاہتے تھے کہ وہ شریک ہوں لیکن لوگوں نے شدید مخالفت کی حد یہ کہ عورتوں کے نام ٹکٹ کا اجرا تک ممنوع قرار دیدیا اسیطرح عطیہ کی بڑی بہن سر بائی فش بیگم صاحبہ آف جنجیرہ نے ندوہ کی بڑی اعانت کی تھی۔ شبلی کی خواہش تھی کہ ان کی قدر دانی کے اعتراف میں دارالعلوم کی نئی عمارت کا افتتاح ان سے کرائیں۔ لیکن مولویوں نے وہ لے دے کی اور وہ احسان فراموشی کا ثبوت دیا کہ شبلی کی ہمت نہ پڑ سکی۔ زہرا بیگم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "جناب بیگم صاحب نے ندوہ کی جو اعانت کی یہ دل اس کا مشکور ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ دارالعلوم کی جدید عمارت ان کے ہاتھ سے کھلتی۔ لیکن ابھی قوم میں اتنی وسیع الخیالی نہیں آئی۔ عطیہ کو لوگوں نے جلسہ میں نہ آنے دیا تو یہ تجویز کب منظور کریں گے۔ حالانکہ میں بالکل اس سے متفق ہوں"۔

جب ہم اس زمانہ کی مذہبی فضا اور سماج میں کٹھ ملاؤں کا زور دیکھتے ہیں پھر شبلی کی خود مذہبی تربیت اور عقاید میں ان کی شدت پر نظر رکھکر یہ دیکھتے ہیں کہ بایں ہمہ وہ اس زمانہ میں بھی مسلمان عورتوں کے لئے موسیقی اور گانا سیکھنا سمجھتے تھے تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ سیرۃ النبی، الفاروق جیسی مذہبی کتابوں کا مصنف مسلمان بیبیوں کے لئے گانا اچھا سمجھتا ہے۔ ان کو اس کے قواعد بتاتا ہے اور جایز قرار دیتا ہے۔ اس معاملہ میں واقعی شبلی کی ترقی پسندی انتہا پسندی تک پہونچ جاتی ہے۔ پھر شبلی کی جرأت پر بھی حیرت ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم آج بیسویں صدی میں بھی مغرب کی جدید تعلیم اور تمدنی اثرات قبول کرنے کے باوجود بھی مسلمان بیبیوں کے لئے گانا اچھا نہیں سمجھتے۔ پھر شبلی نے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ کھلے بندوں علی الاعلان نہ سہی چوری چھپے ہی سہی۔ تصانیف میں نہ سہی پرائیویٹ خطوں میں ہی سہی۔ اب ذرا سوچئے کہ بیچارے سرسید کے ساتھ محض اسلئے کہ وہ مسلمانوں کی قسمت سدھارنا چاہتے تھے کیا کیا کچھ نہ کیا۔ اگر ان خیالات کا پتہ مولویوں کو لگ جاتا اور انکا بس ہوتا تو وہ شبلی کو منصور ثانی بنائے بغیر نہ چھوڑتے۔

دیکھئے اپنے زمانہ کے رجحان کو کس قدر خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں اور پھر آخری فقرے میں اپنے ذاتی خیال کو کتنے اچھوتے پیرایہ میں ادا کرتے ہیں۔ عطیہ کو لکھتے ہیں:۔ "ہم پرانے لوگ آزادی سے پہلے پردہ مجالس علم میں عورتوں کا تقریر کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن آپ تو اس میدان میں آچکی ہیں۔ اس لئے اب جو کچھ ہو کمال [illegible]

ایک دوسرے خط میں عطیہ کو لکھتے ہیں :- "گانے کے ذکر پر ایک بات یاد آئی جو مدتوں سے دل میں تھی لیکن کہنے کی جرأت نہ تھی - میں نے تم سے ایک دفعہ خواجہ حافظ کے شعر سنے تھے - خدا نے تم کو خوش آواز کیا ہے - لیکن افسوس ہوا کہ تم کو ہندوستانی موسیقی سے واقفیت نہیں - اس لئے تم بالکل بے سرا گا رہی تھیں - موسیقی کی معمولی معلومات ضروری ہیں - ورنہ بے لطفی پیدا ہوتی ہے - بارہا تم سے گانا سننے کو جی چاہا لیکن رک گیا کہ تمہاری گلکری اور تانیں بے قاعدہ تھیں - بمبئی میں اس فن کو لوگ مطلق نہیں جانتے - یہاں تک کہ جن کا پیشہ ہے وہ بھی محض جاہل ہیں"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :- "گانا میں خود نہیں جانتا لیکن سمجھ سکتا ہوں یعنی جو گانا خلاف فن موسیقی ہوگا میں بتا سکوں گا کہ خلاف قاعدہ ہے - گراموفون میں پیارے صاحب کے جو گانے بند ہیں، ان کو سنو - پلیٹ پر گانوں کے نام بھی ہوتے ہیں مثلاً دادرا - جھنجوٹی وغیرہ ان سے اندازہ ہو سکے گا کہ گانے میں کس قسم کے سُر اور تان اور گٹکری ہیں - یوں بے قاعدہ گانے میں کتنی ہی عمدہ آواز ہو بے کار ہو جاتی ہے - البتہ میں رواں طور پر مثنوی یا اور اشعار پڑھنے کا طرز بتا سکوں گا جو عام صحبتوں کے قابل ہے"

عطیہ کو لکھتے ہیں :- "اگر بالفرض تم لکھنؤ آؤ تو موسیقی کو ایسے لوگوں سے سیکھ سکتی ہو جن سے سیکھنا عیب میں داخل نہ ہو - بے شک پیارے صاحب وغیرہ سے سیکھنا شرم کی بات ہے وہ لوگ سوسائٹی سے خارج ہیں"

ایک کتاب بھی پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں :- "موسیقی پر ایک مختصر سی کتاب بازار سے منگوا کر بھیجتا ہوں - مفصل ایک کتاب ہے قانون موسیقی - اس میں تمام باتیں نہایت مفصل ہیں"

شبلی کے نزدیک اگر کسی عورت میں تمام خوبیاں موجود ہوں لیکن اس کو موسیقی میں درک نہ ہو تو یہ اسکی بہت بڑی خامی ہے - عطیہ بیگم میں ایک یہی خامی تھی جو شبلی کو بہت کھٹکتی تھی، چنانچہ ان کو لکھتے ہیں - دیکھئے موسیقی کی اہمیت کس قدر دلکش انداز میں سمجھاتے ہیں :- "ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو تم اجازت دو کہ لوگ تم کو پوجیں - وانا اول العابدین (اور میں تمہارا پہلا پوجنے والا ہوں گا -)

شبلی کے خیالات عورتوں کے متعلق بہت ہمدردانہ ہیں - جس سے ان کی وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے - دلچسپ بات یہ ہے کہ عطیہ بیگم کی رائے میں عورتوں کو تنومند اور مردوں کی طرح دنیا کی جد و جہد میں ان کے دوش بدوش کام کرنا چاہئے - ان کے نزدیک عورت کا صحیح مقام دفتر نہیں گھر ہے - برخلاف اس کے شبلی ان کے قایل تھے عورتوں کو مردوں کی طرح علوم حاصل کر کے ان کے دوش بدوش کام کرنا چاہئے - نہ صرف یہ بلکہ زبردستی اپنے حقوق حاصل کرنے چاہئیں -

عطیہ کو لکھتے ہیں :- "عورتوں کے متعلق تمہاری رائے ہے کہ وہ دینوی اور معاشی علوم کم پڑھیں اور اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں - لیکن یاد رکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کئے اس

بل پر سکے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔ تم عورتوں کا بہادر اور پری پیکر ہونا پسند نہیں کرتیں لیکن یہ تو پرانا خیال ہے کہ عورتوں کو دھان پان چھوئی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہئے۔ جمال اور حسن نزاکت پر موقوف نہیں۔ تنومندی، دیوپیکری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قایم رہ سکتا ہے۔ مرد نما عورت زنانہ نزاکتوں سے زیادہ محبوب ہو سکتی ہے۔"

شبلی ایک دوسرے خط میں عطیہ بیگم کو لکھتے ہیں:۔ "عورتوں کی دیوپیکری پر تم نے اس قدر طولانی تقریر لکھی لیکن میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ تو مسلم ہے کہ صحت کے لئے جسم کی موزونی کے لئے، جامہ زیبی کے لئے، مردانہ ورزشیں مفید ہیں۔ جو کچھ بحث ہے یہ ہے کہ عورتوں کے زنانہ حسن میں فرق آتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس سے جمال دوبالا ہو جاتا ہے"۔ ——— نصاب تعلیم کے متعلق ایک یہ خیال عام ہے کہ صنف قوی اور نازک دونوں کے واسطے علٰحدہ علٰحدہ نصاب تعلیم ہونا چاہئے لیکن شبلی اس سے متفق نہیں۔ دیکھئے کس قدر آزادی سے کہتے ہیں:۔ نصاب تعلیم کے متعلق میں سرے سے اس کا مخالف ہوں کہ عورتوں کے لئے الگ نصاب ہو۔ یہ ایک اصولی غلطی ہے۔ جس میں یورپ بھی مبتلا ہو رہا ہے۔ کوشش ہونی چاہئے کہ ان دونوں صنفوں میں جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے وہ کم ہوتا جائے۔ نہ کہ بڑھتا جائے اور بات چیت رفتار گفتار نشست برخاست مذاق زبان سب الگ ہو جائیں۔ یونہی تفرقہ بڑھتا رہا تو دونوں مختلف نوع ہو جائیں گے۔ امریکہ کی ایک لیڈی نے اس پر کتاب بھی لکھی ہے۔

البتہ بعض چیزیں مثلاً رضاعت پرورش اولاد وغیرہ مضامین عورتوں کے نصاب میں اضافہ ہونے چاہئیں"

شبلی کے خط دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے حد حساس اور اس سے بھی زیادہ خوددار تھے۔ باوجود اسکے کہ انھیں عطیہ بیگم سے بہت زیادہ محبت تھی لیکن ان کی خودداری ہمیشہ بیدار رہی۔ انھوں نے ناز برداری ضرور کی لیکن سر نیاز کبھی بھی نہیں جھکایا۔ عطیہ جب ولایت سے واپس آتی ہیں، تو شبلی نے ان کے طرز عمل میں کچھ فرق محسوس کیا اور ان کو لکھا:۔ "میں خیال کرتا ہوں کہ یورپ نے آپ کو ہم لوگوں کی سطح سے بہت بالاتر کر دیا ہے۔ اس لئے یہ توقع رکھنا کہ اب آپ اسی طرح ہم سے ملیں یا ان اطراف کا قصد کریں جیسا کہ وعدہ کیا تھا اب صحیح نہیں۔ خط کی تحریر بھی بہت روکھی اور خوددارانہ ہے بہرحال ——— حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن ست و بس"

ایک مرتبہ عطیہ نے شبلی کو اس قسم کی ایک بات لکھ دی جس سے ان کی خودداری کو بہت ٹھیس پہونچی تو دیکھئے کس قدر تند الفاظ میں لکھتے ہیں:۔ "تم شاید اس کو حسن طلب سمجھتی ہو اور میں شہنشاہ سے بھی اس قسم کا خیال ننگ سمجھتا ہوں"

قرآن مجید کی قیمت دریافت کرنے پر زہرا بیگم کو ڈانٹ ہی چکے تھے۔ ان کے ایک خط کے جواب میں انھیں لکھتے ہیں:۔ ——— لیکن آپ لوگوں نے تو مطلق یاد ہی نہیں کیا۔ شاید آپ کو معلوم ہوا ہو کہ میں بار خاطر ہونے سے پرہیز کرتا ہوں ———

جب میں وہاں تھا یا جب کبھی آپ لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کا ہر وقت کھٹکا رہتا ہے کہ میری ملاقات سے آپ گھبرا نہ گئی ہوں۔"

شبلی اپنے خطوں میں بہت حساس، رقیق القلب اور نازک دل نظر آتے ہیں۔ ایک تو وہ عالم تھا کہ شاگردوں کو دو دو گھنٹے پیٹا کرتے تھے۔ لیکن وہ زمانہ تھا ان کی کٹھ ملائیت کا۔ اب محبت نے ان کے قلب کو گداز کر دیا تھا طبیعت میں سوز اور دل میں تڑپ پیدا ہو گئی تھی۔ ذرا سی تکلیف پر خواہ اپنی ہو یا دوسرے کی بے چین ہو جاتے۔ مولانا حبیب الرحمان صاحب شروانی لکھتے ہیں:۔ "ایک روز ایک نیم مردہ بھڑنے ان کے پاؤں پر ڈنک مار دیا۔ اسقدر بیتاب ہو گئے کہ حیرت ہو گئی۔ اس قدر زمانہ گزرنے پر بھی آج تک اس اضطراب کی تصویر نظر میں ہے۔ یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا۔"

اپنے دوست احباب سے ان کو غایت درجہ کی محبت تھی۔ ان کی تکلیف سے بہت ہی متاثر ہوتے تھے۔ شیروانی صاحب لکھتے ہیں:۔ "اعزہ کے ساتھ بہت اُلفت تھی۔ اپنے بھائی مہدی مرحوم کا ذکر برسوں دلگیری کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ دوسرے بھائی کی موت تو ان کی جان ہی لے گئی۔"

عطیہ نے جب یورپ جانے کا ارادہ کیا تو شبلی نے سوچا کہ بمبئی جا کر ان کو خیرباد کہیں۔ لیکن وہ اپنے حال سے واقف تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ روانگی کے وقت کا تحمل ان سے نہ ہو سکے گا چنانچہ عطیہ کو لکھتے ہیں:۔ "میرا ارادہ تھا اور قطعی ارادہ تھا کہ میں تمہاری روانگی کے وقت بمبئی میں موجود ہوں گا اور تم کو خدا حافظ کہہ سکوں گا۔ لیکن پھر خیال آیا اور غالباً نہ آ سکوں گا۔ کسی عزیز اور دوست کی رخصت کے وقت کا میں تحمل نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ میں دور سے خدا حافظ کہوں۔"

لکھنے کو تو لکھ گئے۔ لیکن جی نہیں مانتا کہ عطیہ ولایت جائیں اور وہ خدا حافظ تک نہ کہہ سکیں۔ اس لئے پھر لکھتے ہیں "باوجود اس کے کہ ولایت کی عین روانگی کے وقت میں بمبئی میں رہنا نہیں چاہتا۔ تاہم چاہتا ہوں کہ بمبئی آؤں اور روانگی سے پہلے اور کہیں چلا جاؤں۔"

لیکن پھر انھیں خیال آیا کہ یہ مشکل ہے۔ انھیں اپنے دل پر اعتماد نہ تھا۔ اس لئے پھر لکھتے ہیں:۔

"عزیزی! خط پہونچا، خدا حافظ کہنے کو میں بمبئی پہلے بھی نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں کسی عزیز کی رخصت کے وقت موجود ہونا نہیں چاہتا۔"

عطیہ کے لئے وداعیہ نظم لکھتے ہیں:۔

اے کہ دل بر سفر نہادستی — زود ازیں منزل دراز آئی
ہم بصد جاہ و احتشام روی — ہم بصد گونہ عز و ناز آئی

دیکھئے شبلی کا خلوص یہاں بھی طرحداری دکھاتا ہے اور ان کی مذہبی طبیعت عطیہ کے لئے یہی چاہتی ہے:-

بروی سوئے پیرس و لندن، وزرہ کعبہ و حجاز آئی،
رسم و آئینِ شرع نگذاری رہ روِ جادۂ نیاز آئی،

ایک اور خط میں دیکھئے خسرو کا کیا دردناک شعر لکھا ہے:-

میروی و گریہ می آید مرا، ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

جب تک یہ لوگ ولایت میں رہتے ہیں شبلی کو بے چینی لگی رہتی ہے۔ زہرا بیگم نہیں گئی تھیں۔ ان سے ہر خط میں برابر لندن کے مسافروں کا تذکرہ اور خیریت پوچھتے ہیں:- "مسافرانِ ولایت کے حالات سے اطلاع دیتی رہئے گا"
ایک اور خط میں لکھتے ہیں:- "مسافران لندن کی صحت اور تفریح خاطر سے خوشی ہوئی" پھر لکھتے ہیں:- "مکرمۂ من! مسافران لندن کے حالات پڑھتا ہوں، اور خوش ہوتا ہوں" ان کی واپسی کی دعائیں مانگتے ہیں:-

"یارب آں کن کہ بصد شوکت و اقبال و حشم آں عزیزانِ سفر کردہ بہم باز آیند"

جب یہ مسافران لندن واپس آتے ہیں تو شبلی بہت مطمئن اور مسرور ہوتے ہیں۔ جوش خلوص قابل دید ہے ایک ایک لفظ سے ان کی دلی مسرت اور سچی خوشی ٹپکتی ہے۔ لکھتے ہیں:- "ایک بے ریا دل، ایک مخلص دل، وفا شعار دل کی طرف سے سفر کی مراجعت قبول کرو"

حسرت کے اس عالم کا اندازہ کیجئے اور ساتھ ہی ساتھ فرض شناسی اور خدمت قومی کے اس جذبہ کی داد دیجئے جو ان الفاظ کی تہہ میں پوشیدہ ہے۔ عطیہ کو لکھتے ہیں:- "میری زندگی کا یہ سخت افسوسناک واقعہ ہے کہ یہ مبارکباد میرے لب کی بجائے زبان قلم ادا کرتی ہے۔ واقعات ایسے ہیں کہ ان کے لئے بھی یہاں سے غیر حاضر نہیں ہو سکتا"

غرض اب تک شبلی ہمیں ایک مکمل انسان نظر آتے ہیں۔ ان کی شخصیت بے داغ اور بے عیب ہے۔ اگر ہم ان کے صرف انہی خطوں کو دیکھتے ہیں جو فیضی بہنوں کو لکھے گئے ہیں تو ہمیں ان کی نیک نیتی، پاکی جذبات اور خلوص و بے ریائی میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ مگر ایک دفعہ زہرا بیگم نے شبلی کی صاحبزادیوں فاطمہ اور صغریٰ کو بہن لکھا تو اس تعلق سے شبلی سے رشتہ بزرگانہ اور پدرانہ ہوا۔ یہ بات شبلی کو کچھ پسند نہ آئی۔ چنانچہ وہ زہرا بیگم کو لکھتے ہیں اور ان کے والد مرحوم حسن فیضی صاحب کا ذکر کرتے ہیں:- "ہاں آپ نے پہلے خط میں صغریٰ اور فاطمہ کو بہن لکھا تھا۔ یہ رشتہ صحیح نہیں۔ حسن صاحب مرحوم عمر اور ہر حیثیت سے میرے چچا تھے اسی لحاظ سے رشتہ قایم ہونا چاہئے۔ میری عمر اسوقت صرف پچاس برس کی ہے۔ اس لئے اتنا بڑا رشتہ میرا حق نہیں" تو یہ قطعی ہے کہ شبلی ان دونوں سے برادرانہ و خواہرانہ تعلقات رکھنے پر رضامند نہ تھے۔ اور وہ زہرا بیگم کو ہمیشہ اس قسم کے القاب لکھتے تھے جن سے ایک قسم کا احترام مترشح ہے مثلاً "خاتون محترم"، "مکرمی"، "مکرمۂ ما" اور آخر میں ہمیشہ اپنا نام شبلی لکھتے تھے۔ لیکن عطیہ بیگم کو ہمیشہ اس قسم کے

الفاظ سے خطاب کرتے تھے جس سے ان کی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے مثلاً شروع میں جب دوستی بے تکلفی تک نہ پہونچی تھی تو "خاتون محترم" سے خطاب کرتے تھے اس کے بعد عزیزی لکھنے لگے کبھی کبھی "قرۃ العینی" بھی لکھتے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اپنی صاحبزادیوں کو بھی قرۃ العینی لکھتے تھے۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ لیکن جب شبلی کے وہ خط بھی ہمارے سامنے آتے ہیں جو انھوں نے اپنے بے تکلف احباب کو لکھے ہیں اور اس میں "کافروں" اور "ظالموں" کا ذکر بھی کرتے ہیں تو ہمیں سخت حیرت ہوتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں لوگوں کی انگلیاں اٹھتی ہیں اور ہماری نگاہیں جھک جاتی ہیں — ایک طرف تو شبلی، عطیہ کو ہمیشہ عزیزی اور قرۃ العینی لکھتے اور دوسری طرف جب اپنے دوستوں کو خط لکھتے تو اس میں کافر اور ظالم اور سلطان جمال کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ مہدی حسن کو لکھتے ہیں :۔ "ٹرکی کی ارتقائی حالت کی نسبت سلطان جمال کی رائے عام دنیا سے مختلف ہے۔ یہاں بھی یکتائی کی شان ہے۔

شبلی کی خط و کتابت عطیہ و زہرا سے کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ وہ ان کے خط اپنے احباب کو مزے لے لے کر سناتے اور ان کے احباب سر دھنتے۔ خود اپنی صاحبزادیوں صغریٰ اور فاطمہ سے ان کی خوبیوں کا ذکر کرتے۔ اس لئے ہمیں ان کی پاکی جذبات میں شبہ نہیں۔ لیکن یہ بات بری طرح کھٹکتی ہے کہ شبلی میں وہ رازدارانہ خلوص نہیں جو سچی محبت کا لازمہ ہے — محبت اور سچی محبت دکھانے، بتانے، سمجھنے اور سمجھانے کی بات نہیں۔ یہ دل کے خاموش گوشوں میں چپکے سے بیدار ہونے والی چیز ہے۔ اس کی مثال اس ٹھہرے ہوئے شفاف پانی کی سی ہے جو بلوریں جام میں رکھا ہو اور دور سے ایسا معلوم ہو جیسے درونِ جام کچھ بھی نہیں۔ البتہ دیکھنے والے تاڑ لیتے ہیں۔ لیکن ایک وفا شعار دل کبھی اپنی آواز لب تک نہیں پہونچنے دیتا۔ غیر تو پھر بھی غیر ہیں بعض لمحوں میں خود اپنے آپ سے بھی غیریت معلوم ہوتی ہے۔ صائبؔ کی غیرتِ عشق خلوص اور رازداری دیکھئے وہ دوسروں کا تو ذکر ہی کیا اپنے محبوب کے لگائے ہوئے زخم کو خود چشم سوزن جیسی چیز کو بھی دکھانا گوارا نہیں کرتا۔

کے بہر تا محرمے زخمِ جگر خواہم نمود من کہ زخمش را نہاں از چشم سوزن داشتم

ہمارے نزدیک یہ امر بھی چنداں قابل گرفت نہیں کہ وہ عطیہ کی نسبت اپنے احباب کو سلطان جمال۔ کافر ظالم اور شان یکتائی کی قسم کے الفاظ کیوں لکھتے ہیں۔ عطیہ کی شخصیت میں انھوں نے اپنے آئیڈیل کو مجسم دیکھا تھا اس لئے ان سے محبت کوئی عجیب اور قابلِ گرفت امر نہیں۔ لیکن سخت قابلِ اعتراض بات ان کی "دوعملی" ہے۔ عطیہ کے خطوں میں تو وہ اپنے آپ کو بہت لئے دئے رہتے ہیں۔ ایک وقار بھی قایم رہتا ہے۔ دوسری طرف بے تکلف احباب میں بالکل کھل کھیلتے ہیں۔

خالد حسن قادری

قدیم سنسکرت لٹریچر

(بہ سلسلۂ ماسبق)

رگ وید کی شاعرانہ تخیل اور اُسکے دیوی دیوتا

اہلِ تحقیق کے نزدیک انسان نے عالمِ وحشت سے بتدریج ترقی کی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے ابتدائی خیالات میں اُس کی علم و آگاہی کے لحاظ سے تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، یعنی یوں تو ایک خیال سے دوسرا خیال وابستہ ہے اور دوسرے سے تیسرا۔ لیکن اس کا امکان ہے کہ اگر ایک نکتۂ خیال معلوم ہو تو دوسرا مضمون دائرۂ معلومات میں نہ ہو۔ اور مدتوں غیر معلوم رہے۔ جب ایسا غیر معلوم نکتہ پردۂ خفا سے عالمِ ظہور میں آتا ہے تو دنیا اُسکا ایجاد ہونا قرار دیتی ہے حالانکہ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ وہ مضمون پہلے سے موجود ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے ماسبق خیال یا خیالات سے وابستہ ہوتا ہے لیکن جب تک اُس کے معلوم کرنے کے ذرایع پیدا نہ ہوں وہ پردۂ راز میں رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایجاد اِس معنی میں کہ پہلے کوئی شے پیدا ہی نہ تھی بعد میں بلا تعلق غیرے یک لخت خلق ہوئی کوئی چیز نہیں۔ اسی نہج پر مذہب کو سمجھنا چاہئے۔ یہ ایک جذباتی یا فطری شے ہے جس پر انسانی تخیل نے طرح طرح کی عمارتیں قایم کر لی ہیں۔ اُن عمارتوں کی جیسی بنیاد ابتدا میں پڑی اُسی ڈھنگ پر مختلف قوموں میں تبدیلیاں ہوتی چلی آرہی ہیں۔ انسان کو فطرتاً اپنی زندگی پیاری معلوم ہوتی ہے باوجود اذیتوں کے وہ دُنیا کی لذتوں سے محروم ہونا نہیں چاہتا اور اپنی زندگی کو صرف فی الحال نہیں بلکہ آیندہ بھی راحت کے ساتھ بسر کرنے کا خواہشمند رہتا ہے۔ دنیا میں ہلاکت کے سامان بھی ہیں اور راحت کے بھی لیکن ابتدائی حالات میں اُس کو اول پر دسترس اور خاطر خواہ قابو نہیں۔ وہ اپنی محدود قوت اور مجبوریوں کو دیکھتا ہے اور اپنے سے زیادہ طاقتور خارجی ہستی کو امید و بیم کی حالت میں محسوس کرتا ہے تاریک اور طولانی بلاؤں سے وہ ڈرتا ہے اور روشن اور پُرامن مظاہرِ قدرت اُس کو بہتری کی امید دلاتے ہیں نتیجہ میں وہ اپنے سے بالاتر قوتوں کی موجودگی کا فطرتاً قایل ہو جاتا ہے لیکن چونکہ اُس کو ابتداءً علم و آگاہی نہیں ہوتی وہ مناظرِ قدرت ہی کو صاحب قوت خیال کرنے لگتا ہے اور اُن کا معتقد ہو جاتا ہے۔

بالا مال کر سکتی ہیں، انسانی تخیل کارفرما ہوتی ہے، اگر طبیعت مائل بہ پستی ہے یا کمزور واقع ہوئی ہے تو خوف کی وجہ سے انسان بلاؤں سے مرعوب ہو کر انھیں سے التجائیں کرنے لگے گا۔ اگر طبیعت میں کمزوری نہیں ہے اور ہمت بلند ہے تو وہ اُن سے متنفر ہوگا اور نفع بخش طاقتوں کے تصور اور اُن کی عبادت سے اپنے آپ کو خوش رکھنے کی کوشش کرے گا۔ خلاصہ یہ کہ جیسے اُس کے جذبات ہوں گے اُنھیں کی بنیادوں پر اُس کی آیندہ زندگی کی عمارت بنتی چلی جائے گی۔

قوموں کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو مختلف قوموں کی طبیعتوں میں بحیثیت قوم بعض مختلف خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً تورانی الاصل قوموں کی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ بلیّات سے مرعوب رہی ہے۔ چنانچہ اُنکے جسقدر دینی آئین اور طریقے ہیں اُن میں موذی اشیاء کی پرستش اور رواج اور بلیّات سے محفوظ رکھنے کے جادو اور ٹونوں کی موجودگی پائی جائے گی۔ سامی طبیعت بلیّات سے مرعوب نہیں پائی جاتی۔ اُس کا رجحان علویات اور اخلاقیات کی طرف ہے یعنی علوی قوتوں کو نفع بخش خیال کرتی ہے۔ آریہ اقوام غور و تفکر کے ساتھ فضائی اور سفلی قوتوں سے متاثر اور زندگی کی نعمتوں کی خواہشمند نظر آتی ہیں۔

بہرحال یہ ہے وہ بنیاد جس پر قوموں کے مذاہب قایم ہوئے اور تغیرات کے ساتھ اب تک رائج ہیں۔ تغیرات کا انحصار انسان کی وقتی علم و آگہی پر رہا ہے۔ انسانی تخیل اُسی حد تک اور اُسی وسعت کے ساتھ کام کر سکتی ہے جس قدر اُس کا دائرۂ معلومات وسیع یا تنگ ہے۔ ابتدائی زمانہ میں اگر اُس نے یہ دیکھا ہوگا کہ ایک اژدہا دوسرے اضحی کو کھا گیا اور اگر سانپ اس کے محسوسات میں سے ایک صاحبِ قوت عفریت ہے تو اُس کی تخیل اس واقعہ کو دیوتاؤں کی جنگ میں منتقل کر سکتی ہے۔ جب اُس نے یہ دیکھا ہوگا کہ آفتاب تاریکی کو دور کر دیتا ہے تو اُس کے دل میں نور و ظلمت کی جنگ کے خیال کا پیدا ہونا بعید از قیاس نہیں۔ اس جنگ کو افسانہ کے لباس میں ظاہر کرنا انسانی تخیل کا ادنےٰ کرشمہ ہوگا۔ اور یہی بنیاد دیوتاؤں کے یا بالفاظِ دیگر مذہبی افسانوں کے قایم اور رائج ہونے کی ہے جس کو انگریزی میں Mythology کہتے ہیں۔ اسی طرح قومی اور خاندانی تفاخر اپنے بزرگوں اور آباؤ اجداد دیرینہ کی بھولی بسری باتوں اور کارناموں کو مبالغہ آمیز تخیل کے ساتھ ایسے افسانوں کی شکل میں ظاہر کر سکتا ہے جس میں اشخاصِ مذکور اگر مکمل دیوتاؤں کی صورت میں نہیں تو کم از کم نیم دیوتاؤں کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔ جن قوموں کے مذہبی آئینوں میں یہ افسانوی پہلو شامل ہو اُس مذہب کے اِس جزو کو یا اُس مذہب ہی کو Mythology یا Mythology کا مذہب کہتے ہیں۔ چونکہ اگلے زمانوں میں تقریباً ہر مذہب اسی قسم کا تھا اس لئے بین الاقوامی Mythology کا مطالعہ ایک مستقل شاخ علوم مروجہ کی

جب اقوام آریہ ہندوستان میں داخل ہوئی ہیں تو اُس معلومات کے اعتبار سے جو رگوید کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہے ظاہر ہوتا ہے کہ اقوام مذکور دُنیوی لحاظ سے تہذیب کی اُس منزل پر تھیں جو مشترکہ طور پر گلہ بانی اور زراعت کی تھی یعنی وہ لوگ ایک مقام سے دوسرے مقام پر چلنے پھرنے والے بھی تھے اور کسی جگہ قیام کر کے زراعت بھی کرتے تھے مذہبی اعتبار سے وہ مناظر و مظاہرِ قدرت کے معتقد اور پرستار تھے اور ہندوستان میں داخلے کے وقت وہ کچھ آئین پرستش بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔

یہ آپ معلوم کر چکے ہیں کہ رگوید کی نظموں کی تصنیف سیکڑوں برس پر حاوی ہے اور اُس کی ترتیب کے بعد بھی سیکڑوں برس پر ویدی لٹریچر کا زمانہ مشتمل ہے۔ بعد کے زمانہ کو چھوڑ کر اگر رگوید ہی کے زمانہ پر اور اُس کی نظموں پر نظر رکھی جائے تو چار پانچ سو برس کے زمانہ میں جو تغیرات قیاس میں آ سکتے ممکن ہیں وہ آریہ قوم کے معتقدات اور پرستش کے طریقوں میں صاف طور سے نظر آتے ہیں۔ اِن تغیرات کی تفصیلی کیفیت مندرجۂ ذیل بیانات سے ظاہر ہوگی اور اسی سلسلہ میں شاعرانہ تخیل کی کارگزاریاں بھی پیش نظر آتی جائیں گی۔

رگوید کے مضامین کو اگر چار حصوں پر تقسیم کر کے نظر ڈالی جائے تو شاید سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ یہ تقسیم باعتبار زمانہ اس طرح کی جا سکتی ہے:۔

۱۔ اُسوقت کی باتیں جب ہندو ایرانی و یوروپ میں پھیلے ہوئے آریہ فرقے کسی قدیم زمانہ میں ایک جگہ رہتے تھے

۲۔ اُسوقت کی باتیں جب یورپی فرقے تو علٰحدہ ہو چکے تھے لیکن ہندو ایران کی قومیں یکجا تھیں۔

۳۔ ہندوستان میں داخلہ کے بعد آریہ فرقوں کی وہ باتیں جو ہندی الاصل ہیں۔

۴۔ ہندوستان کے قدیم باشندوں کی وہ باتیں جو آریہ فرقوں نے اپنی باتوں میں شامل کر لیں۔

رگوید میں دیوتاؤں کی تعداد تین مرتبہ گیارہ یعنی تینتیس بیان کی گئی ہے۔ حالانکہ اُس میں بہت سے دیوتاؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کائنات کا بھی مفہوم یہ ہے کہ وہ تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ آسمان۔ ہوا (یعنی آسمان و زمین کی درمیانی فضا) اور زمین۔

آسمان اور ہوا مافوق الانسان ہستیوں یا خدائی صفات رکھنے والی شخصیتوں سے معمور خیال کئے گئے ہیں۔ یہ ہستیاں زمین پر بھی آتی جاتی ہیں اور کارفرما ہوتی ہیں۔ اُن میں نیک بھی ہیں اور بد بھی۔ مظاہرِ قدرت کا ابتدائی مفہوم یہ ہے کہ وہ کسی قدرتی آئین کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ عالمِ غیب کی ہستیوں کے افعال کا نتیجہ ہیں اسکے علاوہ بے جان اشیا مثلاً درخت۔ پہاڑ۔ ندی وغیرہ یعنی مناظرِ قدرت میں بھی اسی قسم کی ہستیوں کا وجود ہے۔

مذکورہ ذہنی عقاید کے تحت اول خدائی شخصیتوں میں آسمان و زمین کا جوڑا ہے۔ زمین کا نام پرتھوی ہے جس کے معنی ہیں 'پھیلی ہوئی شے' یہ معنی اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ عقیدہ اُس زمانہ سے متعلق ہے جب

یورپی، ایرانی اور ہندوستانی آریہ فرقے کسی ایک کشادہ اور میدانی جگہ میں متفقہ صورت میں آباد ہوں گے۔ اس عقیدہ کے مفہوم کا ربط پنجاب کے شمالی کوہستانی علاقوں اور ایران کے پہاڑی منظروں سے نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح آسمان کی کیفیت ہے جس کا نام 'دیئوس' ہے یہی لفظ جس کے معنی 'روشن ہستی' کے ہیں۔ لاطینی۔ فرانسیسی اور یونانی زبانوں میں خفیف سی تبدیلی کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ یونانی میں 'زیوس' لاطینی میں 'ڈیوز'۔ فرانسیسی میں ڈیو خدائی معنوں میں زمانۂ قدیم سے موجود ہیں۔ دَیئُ دُس پتر ویدی زبان کا وہی لفظ ہے جو لاطینی قوموں کا جوپیٹر ہے دیئُ دُس پتر جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہے موجودات کا باپ ہے اور پرتھوی ماں۔ ان ماں باپ سے سب چیزیں دیوتا سمیت پیدا ہوئی ہیں اور یہی سب کی پرورش کرتے ہیں۔ یوں تو آسمان کے لئے ویدی زبان میں متعدد الفاظ استعمال ہوئے ہیں لیکن یہ نام مخصوص طور پر بہ حیثیت دیوتا ہے اُس کا لقب رگوید کی ابتدائی نظموں میں آسُور بمعنی خداوندِ نعمت و رحمت ہے اور لفظ دَیئُ دُس ہمیشہ اس لقب کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ اَوِستا میں یہ لفظ آہُور ہے اور اُس کے معنی بھی وہی ہیں۔ رگوید کے پچھلے زمانہ میں لفظ آسور کے معنے بدلے ہوئے پائے جاتے ہیں یعنی سابق کے مقابلہ میں اُس کے معنی شیطانی ہستی کے ہو گئے اور اُس کے سابقہ معنی میں اُس کے بجائے 'دیوا' (یائے مجہول کے ساتھ) کا لقب استعمال میں آنے لگا جس کے معنی ویدی زبان میں روشن ہستی کے ہیں۔ اِس لفظ کی اصل دیَو (بہ یائے معروف) ہے جس سے ہندی کے الفاظ دِیا اور دیپک وغیرہ نکلے ہیں اَوِستا میں لفظ دَیو اُن شیاطین کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اہرمن کے گروہ میں شامل ہیں۔

یہاں ایک نکتہ قابلِ ذکر ہے۔ الفاظِ مذکور کی متضاد معنی کے اعتبار پر بعض محققین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ایرانی اور ہندوستانی آریہ فرقوں کے افتراق کی وجہ مذہبی اختلاف تھا اور وہ اختلاف اس قدر زبردست تھا کہ اُن فرقوں نے الفاظ کے معنی صرف بدل ہی نہیں دئے بلکہ بالکل برعکس کر دئے۔ دیگر محققین کے نزدیک یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔ اُن کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ رگوید میں لفظ آسور کے معنی میں تبدیلی بتدریج اس وجہ سے واقع ہو گئی کہ پچھلے زمانہ میں اس لفظ کو دو اجزا آ اور سُور پر مشتمل خیال کر لیا گیا۔ آ نفی کا وہ کلمہ ہے جو کسی لفظ کے شروع میں چسپاں کر دینے سے اُس لفظ میں نفی کے معنی پیدا کر دیتا ہے۔ اس طور سے سُور (اَوِستی زبان کے ہُور) میں نفی کے معنی پیدا ہو گئے اور لفظ اَسُور شیطانی ہستی کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اِس لفظ کے ہاتھ سے نکل جانے سے دوسرے ہم پلہ لفظ کی ضرورت پیدا ہوئی جو دیوا کی ایجاد سے رفع کی گئی۔ شروع میں اس لفظ کے معنی جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے روشن یا منور ہستی کے رہے لیکن کثرت استعمال سے بعد میں لفظ مذکور دیوتا (یعنی قابلِ عبادت و پرستش ہستی) کے معنی میں استعمال ہونے لگا جیسے کلمۂ توحید میں الٰہ کا لفظ۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زرتشت نے ایک مظہرِ نور کے عقیدہ کے سلسلہ میں دیوتاؤں کے مذہب کو شرک

قرار دے کر اس لفظ کو اہرمن کے مترادف قرار دیدیا۔ اِس لفظ میں اختلافِ معنی کی ایک اور توضیح بھی کی جا سکتی ہے۔ ابھی بیان کیا جا چکا ہے کہ ویدی زبان کے لفظ دیوا کی اصل دیو ہے جس کے معنی روشن کے ہیں۔ ایسا قیاس ہوتا ہے کہ اوستی زبان کا لفظ دیو دوسری اصل سے مشتق ہے یعنی لفظِ مذکور لفظ دَہیُو سے مشتق ہے۔ یہ وہ لفظ ہے جس سے داس نکلا ہے۔ اوستی میں یہ لفظ دَہیُو ہے جو کثرت استعمال سے دیو ہو سکتا ہے۔ ابتداً دونوں زبانو میں لفظ دَہیُو اُن قوموں اور فرقوں سے منسوب تھا جن سے آریہ قوم کا سابقہ پڑا۔ ہندوستان میں آریوں کا مقابلہ سیاہی مائل ڈراوڈ وغیرہ اقوام سے ہوا جن کو دَہیُو خطاب دیا گیا جس کا اولین مفہوم 'غیر اقوام' تھا۔ بعد میں جنگ کی خونریزی اور غارتگری کے حالات پیدا ہونے پر 'دشمن'، اور اس کے بعد "شیطان و عفریت" کا مفہوم پیدا ہوا۔ اور جب وہ لوگ مغلوب کر لئے گئے تو 'داس' کی شکل میں اُس کے معنی غلام کے ہو گئے۔ اسی طرح ایران میں بھی اس لفظ کے معنی میں عفریت کے مفہوم کے ساتھ تبدیلی واقع ہونے کا خیال سمجھ میں آسکتا ہے اور اختلافِ مذہبی کی بنا پر الفاظ کے معنی کی تبدیلی کی دلیل دور از کار ہو جاتی ہے۔ واضح ہو کہ فارسی لفظ دہقان بھی اسی لفظ دَہیُو سے برآمد ہونا قیاس کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ لفظ ایک اور لفظ دہی سے نکلا ہو جو دریائے جیحون اور بحر کاسپین کے درمیانی علاقہ میں رہنے والی ایک قوم کا نام تھا۔ جب آریہ فرقے اُدھر سے گزرے ہوں گے تو قوم مذکور سے اُن کا تصادم ہونا لازمی تھا۔

بہرحال جب اقوام آریہ ہندوستان میں آئی ہیں تو وہ قدیم لفظ دیوا کا استعمال بھی ساتھ لائی تھیں جس کا مفہوم روشن ہستی اور نعمت دینے والی یا خدائی صفات سے متصف قوت تھی۔ ایسی لاتعداد ہستیاں یا قوتیں تھیں جن پر اُن لوگوں کا اعتقاد تھا اس لئے رگوید کے بھجن مناجات اور دیوتاؤں کے افسانوں پر مشتمل ہیں۔ از روئے مضامین رگوید آسمان و زمین کا جوڑا اولین دیوتاؤں میں سے تھا۔ رگوید میں چھ بھجن اِس جوڑے کے نام پر ہیں۔ دیوتا کی حیثیت سے اُن کا صرف یہ مفہوم ہے کہ وہ کُل موجودات کے ماں باپ ہیں۔ پرتھوی کی حیثیت بمقابلہ دیئی اُوس کمتر ہے اور اس لئے شاعرانہ تخیل نے اپنے جوہر زیادہ تر دیئی اُوس کے متعلق دکھلائے ہیں۔ کبھی تو وہ ایسا مشکی گھوڑا ہے جو موتیوں سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ کبھی وہ ایسا سُرخ رنگ کا نر گاؤ ہے جو اپنی گردن اور سر نیچا کئے ہوئے دھاڑ رہا ہے (گرج کے ساتھ بارش کا سماں) ایک شاعر اُس کو بادلوں میں سے مسکراتے ہوئے دیوتا کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔ رگوید میں اکثر مقامات پر تبسم سے مراد بجلی لی گئی ہے۔ اس دیوتا کو اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ وہ نفس آسمان سے متعلق ہے جو ایک چمکیلا جسم ہے۔

دیئی اُوس سے اہم تر اور اُتنا ہی زیادہ قدیم ایک اور دیوتا ہے جو آسمان کی ایک خاص صفت سے متعلق ہے۔ اُس کا نام وَرُن ہے۔ یہ لفظ ایسی اصل (وری) سے مشتق ہے جس کے معنی محیط، گھیرنے والے

پھیلنے والے کے ہیں۔ ظاہر نظر میں آسمان کل عالم کا احاطہ کئے ہوئے اور ڈھانکے ہوئے ہے۔ یہی صفت اس دیوتا کی ہے یا یوں کہئے کہ یہی صفت بطور خود دیوتا ہے یا آسمان اس صفت کے ساتھ دیوتا ہے۔ چونکہ یہ صفت ایسی جامع ہے کہ اُس کے دائرہ کے اندر کل عالم داخل و شامل ہے بتدریج اس دیوتا کے اوصاف میں عروج و ترقی ہوتی جاتی ہے اور آخر کار ایک اعلیٰ قوتِ بسیط کی شکل میں وہ کائنات کا منتظم قائم ہو جاتا ہے۔ گو بعد کے زمانہ میں اُس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے اور وہ محض سمندر کے دیوتا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایک محقق نے اس قسم کے صفاتی دیوتاؤں سے متعلق ایک نظریہ بیان کیا ہے جس کا ذکر اس جگہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ عام کلیہ کے طور پر وہ یہ کہتا ہے کہ جب کوئی شاعرِ خیال بند اپنے دل و دماغ کی آنکھوں سے کوئی منظر یا سماں دیکھتا ہے اور اُس کی تخیل میں مستغرق ہو جاتا ہے تو اُس کا تصور شے متخیلہ کو اُس کے سامنے ایک مجسمہ کی شکل میں پیش کر دیتا ہے۔ اِس حالت میں شاعر اُس کو حقیقتاً ایک ایسی شخصیت سمجھنے لگتا ہے جو متصف باوصاف مختلفہ ہے اور اپنے جادو بھرے الفاظ میں اُس شخصیت کی ذات و صفات و افعال کی ایسی تصویر کھینچتا ہے جو خود اُس کے واسطے اور دوسروں کے واسطے ایک قابلِ یقین وجود کے تسلیم کئے جانے کے لئے بڑی گنجائش پیدا کر دیتی ہے۔ اس طرح پہلے جو شے محض سماں یا منظر یا صفت تھی وہ ایک مستقل ذات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور شاعر کے تخیلات یا جذبات الہام کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اِس ترقی کے زمانہ میں یہ سب باتیں شاعری کے ذیل میں آتی ہیں لیکن ایامِ جہالت میں یہی امور بالآخر پیکرِ خیال کو دیوتا قرار دیدیتے ہیں اور اس طور سے صرف ایک خاصہ ہی مرتب نہیں ہو جاتا ہے بلکہ ایک شخصیت کی جگہ دو شخصیتیں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً دیوؤس آسمانی دیوتا تھا ہی لیکن اُس کی صفتِ 'محیط' بھی بطورِ خود ایک علٰحدہ دیوتا ہو گئی۔ رگوید ایسی تمثیلوں سے بھرا پڑا ہے۔

چنانچہ اس قاعدۂ کلیہ کے تحت وَرُن بھی رگوید کا ایک قدیم دیوتا ہے جس کے ابتدائی وجود کا اُس زمانہ سے تعلق ہے جو ہندو ایران و یورپ کی آریہ اقوام کا مشترکہ عہد تھا۔ یونان کی Mythology میں اُورینوس سمندر کا دیوتا ہے جس طرح وَرُن ہندوستان میں فضائی سمندروں کا دیوتا ہے۔ امتدادِ زمانہ کی بدولت اور اُس کے ساتھ ساتھ تفریقِ جماعت اور اختلافِ سکونت کے طفیل ابتدائی تخیل و عقاید میں تبدیلیاں اور اختلاف ہونا لابد ہے تاہم محققین نے رگوید کے وَرُن اور قدیم ایرانیوں کے مزد میں مطابقت ہونے کی مدلل کیفیت ظاہر کی ہے۔ مزد قدیم ایرانیوں کا ویسا ہی آسمانی دیوتا تھا جیسا وَرُن پایا جاتا ہے۔ رگوید میں وَرُن کی یہی صفت مزد کی کتاب اَوِستا میں ہے جب ایک شخصیت ساری دُنیا کو احاطہ کئے ہوئے ہے تو سب چیزیں اُسکی

نظر کے سامنے ہیں۔ لہذا اُس کو ہر چیز معلوم ہے اور وہ ہر جگہ موجود ہے۔ چنانچہ ان دونوں زائد صفات کے ساتھ رگوید میں وَرُن کا نام لیا جاتا ہے۔ اَوِستا میں بھی مزدا کے معنی صاحبِ علم وسیع ہیں۔ علاوہ ازیں اَوِستا میں مزدا کے نام کے ساتھ آہُور (بمعنی خداوند نعمت) کے لفظ کا اور رگوید میں وَرُن کے نام کے ساتھ آسُور کے لقب کا استعمال برابر پایا جاتا ہے۔ جس طرح سورج رگوید میں وَرُن کی آنکھ ہے اُسی طرح آوستا اس آفتاب آہُورمزدا کی آنکھ ہے۔ جیسے ایک جگہ مزدا کا لباس ستاروں جڑا ہوا آسمان ہے۔ نیز جیسے خود آسمان مزدا کا جسم ہے ویسے ہی دوسری جگہ یعنی رگوید میں وَرُن کا بیان ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایران میں زرتشت نے جب اپنا مذہب رائج کیا تو آہورمزدا کو آسمانی مادی جسم اور جسمانیت سے پاک وصاف کرکے تقریباً اُس روحانی منزل تک پہونچا دیا جہاں آج کل کے خیالات کے مطابق ہم خدا کو خدائی حیثیت سے سمجھتے ہیں۔ لیکن رگوید میں وَرُن روحانیت کے اہم درجے طے نہ کرسکا اور درمیان میں رگوید کے زمانہ ہی میں کچھ ایسی اُفتاد پڑی کہ بعد کے زمانہ میں ترقی معکوس کی شکل پیدا ہوگئی اور وہ اتھروید اور اُس کے آس پاس کے زمانہ میں محض سمندر کا دیوتا بن کر رہ گیا۔ رگوید میں اس کے مدارجِ ترقی سے متعلق یہ بات تو ابھی بیان کی گئی ہے کہ وہ سارے عالم کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے اور ہر جگہ حاضر وناظر ہے۔ ان صفات سے اُس کا محافظ ہونا اور علیم وبصیر ہونا کسی دلیل کا محتاج نہیں رہتا۔ چونکہ وہ خود ایک صفاتی دیوتا ہے اسلئے اُس کے مفہوم میں جسمانیت کا عنصر رفتہ رفتہ اور بھی کم ہوتا جاتا ہے۔ اُس کی نظر کے سامنے چاند سورج تارے ایک ترتیب کے ساتھ نکلتے ہیں اور غائب ہوتے ہیں۔ موسم کے ترتیب کے ساتھ آتے جاتے ہیں۔ رات دن کی ایک معینہ اور باقاعدہ گردش ہوتی رہتی ہے۔ پس یہ باقاعدگی اور ترتیب اُسی دیوتا سے متعلق ہوجاتی ہے اور وہ ان سب باتوں کا ترتیب دینے والا قرار پاجاتا ہے۔ ترتیب اور باقاعدگی کیا چیز ہے۔ وہ رِیتْ ہے (غالباً ریت وہی لفظ ہو جو انگریزی میں Right ہے) رِیتْ یعنی قانون قاعدہ۔ لہذا وَرُن رِیتْ یعنی قاعدہ بنانے والا ہے۔ اُس کے بنائے ہوئے قاعدے کے مطابق سورج، چاند، موسم وغیرہ وغیرہ اپنے اپنے کاموں پر لگے ہوئے ہیں۔ روحانی تخئیل کا ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے۔ جب وَرُن سورج وغیرہ مادی اشیا کا رِیتْ قایم کرنے والا ہو تو انسان بھی اُس کی دسترس سے باہر نہیں۔ لہذا انسانی افعال بھی اُس کے قانون کے ماتحت ہوجاتے ہیں یعنی اچھے اور بُرے افعال اُس سے متعلق ہوجاتے ہیں اور وہ بُری باتوں کی سزا دینے والا بھی ہوجاتا ہے جسکے نتیجہ میں اُس سے گناہوں کی معافی چاہی جاتی ہے۔ چونکہ زمین وآسمان کی درمیانی فضا اُس کے اندر داخل وشامل ہے وہ اِس فضائی سمندر کا مالک ومنتظم ہے۔ اس فضائی سمندر میں وہ چاند سورج کے لئے راستہ بناتا ہے۔ ندیاں بہاتا ہے۔ مینہہ برساتا ہے۔ اُس کا ہر کام قاعدہ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اُس کی کارروائیاں طوفانی نہیں ہوتیں بلکہ امن کا پہلو لئے ہوتی ہیں۔ اُس کے چار چہرے ہیں (چار جہات) اتھروید میں اُس کی تین چمکتی ہوئی آنکھیں

ہیں۔ چاند۔ سورج اور بجلی۔ اور رگوید کے مطابق اُس کا پیر مشتعل ہے۔ (آفتاب)

اس تشریح کے بعد اب رگوید کے چیدہ چیدہ مقامات کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ مضمونِ صدر کا رگوید کی عبارت سے مقابلہ ہو سکے۔

"ایسا گیت گاؤ جو ورن بادشاہ کو پسند آئے۔ یعنی اُس کو جس نے زمین کو اس طرح پھیلایا جیسے کوئی قصاب بیل کے چمڑہ کو دھوپ میں پھیلاتا ہے۔ وہ جس نے جنگل کے درختوں سے ٹھنڈی ہوائیں بھیجیں۔ گھوڑے (آفتاب) میں تیزی و تندی بھر دی۔ مادہ گایوں کو (بادلوں کو) دودھ سے پُر کر دیا۔ دل میں عقل اور پانی میں آگ (بادلوں میں بجلی) رکھی۔ سورج کو آسمانوں میں اور سوم کو پہاڑوں پر قائم کیا۔ اُس نے بادلوں کی ناندیں اوندھا کر اُن کے پانیوں کو آسمان۔ ہوا اور زمین پر بہا دیا۔ اور مٹی اور فصلوں کو تر کر دیا۔ وہ آسمان اور زمین کو تری پہونچاتا ہے اور جیسے ہی وہ اُن گایوں (بادل) کے دودھ کی خواہش کرتا ہے گرجتے ہوئے بادلوں سے پہاڑ گہر جاتے ہیں اور مضبوط سے مضبوط چلنے والے تھک جاتے ہیں" (منڈل ۵ بھجن ۸۵)

"ورُن نے سورج کا راستہ بنایا اور پانی (بصیغہ جمع) کو فضائی سمندر میں بہتا ہوا بھیجدیا۔ دنوں کے لئے اُس نے چوڑے راستے مقرر کئے اور اُن کی وہ اس طور سے رہنمائی کرتا ہے جس طرح کوئی گھوڑا دوڑانے والا اپنی گھوڑیوں کی۔ اُس کی سانس وہ بادِ صرصر ہے جو ہوا میں تیزی سے گزرتی ہے" (منڈل ۷، بھجن ۸۷)

"وہ معظم و مقدس رخشِ خورشید کو آگے بڑھاتا ہے۔ جس سے ہزار نعمتیں پیدا ہوئی ہیں۔ جب میں اُس کے چہرہ پر نظر کرتا ہوں تو وہ مجھکو ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے شعلوں سے بھڑکتی ہوئی آگ اُس حالت میں جبکہ بادشاہ مجھ کو آسمانی ظلمت و روشنی دکھاتا ہے"۔ (منڈل ۷، بھجن ۸۸)

"یہ اوپر والے تارے جو رات کو دکھائی دیتے ہیں، دن میں کہاں چھپ جاتے ہیں۔ لیکن وُرُن کے احکام اور قاعدے نہیں بدلتے اور چاند رات کے درمیان سے چمکتا ہوا اور روشن گزر جاتا ہے" (منڈل ۱ بھجن ۲۴)

"وہ جو اُن پرندوں کا جو فضائے وسیع میں اُڑتے ہیں راستہ جانتا ہے اور سمندر میں جہازوں کا... ..... وہ جو بادِ صرصر کا راستہ جانتا ہے۔ وہ اپنے مقام پر بیٹھا ہوا ہے اور قانون کی حفاظت کر رہا ہے۔ وہ بادشاہ مقتدر وُرُن ہے۔ وہ اپنے مقام سے ہر پوشیدہ شے پر۔ اور ہر اُس چیز پر جو ہو چکی ہے یا اُس کام پر جو ہونے والا ہے توجہ کے ساتھ نظر ڈال رہا ہے۔ سنہری زرہ سے آراستہ و پیراستہ وہ رونق و شان کو لباس کی طرح اوڑھے ہوئے ہے اور اُس کے چاروں طرف اُس کے جاسوس (رات میں تارے اور دن میں شعاعیں) بیٹھے ہوئے ہیں" (منڈل ۱، بھجن ۲۵)

مظاہرِ قدرت میں ایک ریت۔ قانون۔ طاری و ساری ہے۔ یہ تو مندرجۂ بالا انتخابات سے واضح ہوتا ہے

اس منزل سے آگے بڑھکر روحانیات کے راستہ پر اخلاقیات کی ریت کے کس درجہ تک قدیم ہندی آریہ پہونچے تھے اُس کی کیفیت بھی ظاہر کی جاتی ہے۔ رگوید کے شاعروں یا رشیوں میں سے ایک رشی وَشِشٹھ ہے کوئی زمانہ تھا جب وَرُن وَشِشٹھ پر مہربان تھا۔ ایک بھجن میں رشی مذکور اُس مہربانی کی حالتوں کا اظہار کرتا ہے اور وَرُن کو رو در رو دیکھتا ہے۔ وَرُن اُس کو اپنے جہاز پر سوار کرلیتا ہے۔ اور وہ دونوں آسمانی دریاؤں میں جھکولے کھاتے ہوئے جھولتے ہوئے پھرتے ہیں۔ اُنھیں اوقات میں وَرُن رشی کو گیت بنانے اور گانے کا عطیہ بخشتا ہے اور جب تک صبح و شام قایم ہیں وَشِشٹھ کو اپنا رشی مقرر کرتا ہے۔

اُس کے بعد ایک زمانہ آتا ہے جب وشِشٹھ رنج و غم میں گرفتار ہے۔ شاید بیمار ہے اور خیال کرتا ہے کہ وَرُن نے اپنی مہربانی سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ اُس حالت کا وشِشٹھ اپنے بھجنوں میں نقشہ کھینچتا ہے۔ ملاحظہ ہو ترجمۂ ذیل :-

"ہماری وہ دوستی کہاں گئی جب ہم دونوں آپس میں بے ضرر گفتگو کیا کرتے تھے اور جب مجھ کو تیرے ہزار دروازہ والے مکان میں پہونچنے کی اجازت تھی۔ اگر اے وَرُن تیرے دوست نے جو تجھ کو پیارا تھا۔ اگر تیرے ہم نشین نے تجھ کو آزردہ خاطر کر دیا ہے ہم کو اے مقدس شخصیت ہمارے جُرم کے مطابق سزا مت دے بلکہ تو شاعر کی جائے پناہ بن جا" (منڈل ۷ بھجن ۸۸)

"میں اپنے دل سے کہتا ہوں۔ میں وَرُن سے پھر کب مل جاؤں گا؟ کیا وہ میری نذر و نیاز کو بغیر ناراضگی کے پھر قبول کرے گا؟ میرے دل میں اطمینان پیدا ہو کہ میں کب وَرُن کو اپنے آپ سے راضی دیکھوں گا؟ میں سوال کرتا ہوں تاکہ مجھے اپنا گناہ معلوم ہو جائے۔ میں عقلمندوں سے پوچھنے کے لئے جاتا ہوں۔ وہ سب یہی کہتے ہیں کہ بادشاہ وَرُن ہی ہے جو تجھ سے ناراض ہے۔"

"اے وَرُن وہ کون سا بدترین فعل ہے جس کی پاداش میں تو اپنے پوجنے والے اور دوست کو سختی میں مبتلا کر رہا ہے۔ ہم کو ہمارے آبا و اجداد کے گناہوں سے نجات دے اور جو گناہ ہم نے خود کئے ہیں اُنھیں معاف کر دے۔ جس طرح بچھڑے کی رسّی کھول دیتے ہیں اُسی طرح وشِشٹھ کو چھڑا دے۔ وہ (غالباً نیتِ بد یا فعلِ بد) ہمارا قصداً نہیں تھا۔ وہ اِغوا تھا۔ منشی شراب تھی۔ خواہشِ نفسانی تھی۔ کمبیتن کے دانے تھے۔ عدم ہوشیاری تھی۔ مضبوط کمزور کو الٹ پلٹ کر دیتا ہے۔ نیند کچی راہی سر پر لے آتی ہے" (منڈل ۷ بھجن ۸۹)

"اے وَرُن ابھی مجھے مٹی کے گھر میں مت داخل ہونے دے۔ اے قادر توانا رحم کر رحم کر۔ اگر میں اس طرح کانپتا چلوں جیسے ہوا کی تیزی سے بادل پھرتے ہیں تو اے قادر توانا رحم کر رحم کر۔ اے مقدس شخصیت توانائی نہ ہونے کی وجہ سے راہ سے بے راہ ہو گیا ہوں۔ اے قادر توانا رحم کر رحم کر۔ تیرے پجاری کو پیاس نے

آگھیرا ہے حالانکہ وہ پانی کے بیچوں بیچ کھڑا ہے۔ (غالباً شاعر استسقے کے مرض میں مبتلا ہے) اے قادر توانا رحم کر رحم کر۔ ہم انسان ہیں۔ جب ہم آسمانی دیوتاؤں کے حضور میں کوئی جرم کریں اور جب اپنی غفلت اور بے خیالی سے تیرے قانون کی خلاف ورزی کریں۔ اے قادر توانا رحم کر رحم کر" (منڈل ۷ بھجن ۸۹)

مندرجۂ بالا قسم کی اور بھی مناجاتیں ہیں۔ تھوڑے سے اقتباس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :-

"خواہ کتنا ہی ہم تیرے قانون کی خلاف ورزی روز بروز کریں جیسا کہ انسانوں کا طریقہ ہے اے وُرُن ہم کو موت کے سپرد مت کر اور نہ اہلِ خشم و اہلِ غضب کی مار دھاڑ کے حوالے کر اور نہ حاسدوں کی غضبناکی کے سپرد کر۔ میرے گیت تیری طرف ایسے اُڑ کر جاتے ہیں جیسے پرند اپنے آشیانہ کی طرف یا گائیں مرغزار کی طرف"

(منڈل ۱۔ بھجن ۲۵) — (باقی) ا - ح

قیامت کس طرح آئے گی

کرۂ زمین کی تباہی کے پانچ اسباب بتائے جاتے ہیں :- ٹھنڈ۔ خشکی۔ گرمی۔ تصادم اور غرقابی۔ یعنی انھیں میں سے کوئی نہ کوئی سبب زمین کی بربادی کا ہو سکتا ہے۔

جافری ڈینس، غرقابی کو ترجیح دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ " زمین آہستہ آہستہ مسطح ہوتی جا رہی ہے۔ یعنی وادیاں اونچی ہوتی جاتی ہیں اور پہاڑ پست ہوتے جا رہے ہیں، اس لئے ایک وقت ایسا آئے گا جب خشکی کی سطح پانی کی سطح سے نیچے ہو جائے گی اور ساری زمین پانی سے ڈوب جائے گی لیکن اس کا امکان ایک فیصدی سے زیادہ نہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ زمین، کسی دوسرے سیارہ سے ٹکرا کر برباد ہو جائے گی۔ اگر ٹکرانے والا سیارہ مشتعل حالت میں ہے تو زمین و اہل زمین کو جھلسا دے گا اور اگر وہ انجمادی حالت میں ہے تو لوگ ٹکر کے صدمے سے ہلاک ہو جائینگے لیکن اس کا امکان بھی صرف دو فی صدی ہے۔

پراکٹر، مشہور ماہر فلکیات کہتا ہے کہ " اگر آفتاب کی حرارت دس گنا بڑھ جائے جس کا امکان ہے تو کوئی جاندار یہاں زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن اگر یہ حرارت ۱۰۰ گنا بڑھ جائے تو سارا کرہ خاکستر ہو کر رہ جائے۔ لیکن اس کا امکان بھی دو فیصدی سے زیادہ نہیں۔

ایک جماعت کہتی ہے کہ زمین ہر سال گیارہ مربع میل کے اندازہ سے خشک ہوتی جا رہی ہے اور پانی کا اتنا ہی حصہ اس میں جذب ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے ایک وقت ایسا آ سکتا ہے جب تمام سمندر اور دریا آہستہ آہستہ خشک ہو جائیں اور دنیا فنا ہو جائے۔ لیکن اس کا امکان بھی پندرہ فی صدی سے زیادہ نہیں۔

اب رہی ٹھنڈ سو اس کا امکان ۸۰ فی صدی بتایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زمین کا درجۂ حرارت بلا برابر کم ہوتا جا رہا ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ موجودہ سرد مقامات میں زمین کے اندر سے بہت سی چیزیں ایسی برآمد ہوتی رہتی ہیں جو گرم مقامات ہی میں پائی جا سکتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ انگلستان کا موسم کسی زمانہ میں وہی تھا جو جزیرۂ تاہیٹی کا، یعنی نہایت معتدل و خوشگوار۔ اس لئے اگر حرارت ستر درجہ اور کم ہو گئی تو یقیناً یہاں کے تمام جاندار ٹھٹھر کر فنا ہو جائیں گے۔

"فراق گورکھپوری" اور "اُردو کی عشقیہ شاعری"

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق کا ایک مضمون "اُردو کی عشقیہ شاعری" کے عنوان سے سالنامہ نگار جنوری ۱۹۶۱ء کے صفحات ۶۸ - ۷۲ پر شایع ہوا ہے - اس میں انھوں نے عشقیہ شاعری سے بحث کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے کہ شہوانی یا جنسی جذبہ جب تک اپنے اندر عشق کے عناصر جذب نہ کرلے، عشقیہ جذبہ نہیں کہلا سکتا۔ انھوں نے عشق کے عناصر کی تشریح کئے بغیر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو کی عشقیہ شاعری کا سرمایہ کالی داس، بھوبھوتی بھرتری ہری اور دوسرے سنسکرتی شعراء کی عشقیہ شاعری کے مقابلہ میں انتہائی ناقص ہے۔ تھوڑی دیر کیلئے اگر فراق کا یہ فیصلہ قبول کرلیا جائے تب بھی تنقیدی ذوق کو سیری نہیں ہوتی، کیونکہ انھوں نے اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی، حالانکہ بہ حیثیت ایک نقاد کے ان کا فرض تھا کہ وہ اپنے بیان کی تائید میں دلیلیں پیش کرتے یا اگر وہ دلیلیں پیش نہیں کرسکتے تو کم سے کم جن دو زبانوں کا مقابلہ کیا گیا ہے ان کے عشقیہ جذبات تو پیش کرسکتے تھے - یعنی وہ یہ تو کرسکتے تھے کہ سنسکرت شعرا کا بلند پایہ عشقیہ کلام اور اُردو کی عشقیہ شاعری کا بدترین کلام پیش کرکے دونوں کا موازنہ کرتے اور ایک کی برتری دوسرے پر دکھلاتے؟ مجھ کو یقین ہے کہ فراق ایک نقاد کے فرائض کو بخوبی جانتے ہیں مگر اس کے باوجود انھوں نے دونوں زبانوں کی عشقیہ شاعری کے نمونے پیش کرنے سے گریز کیا ہے اس کا کوئی سبب ہونا چاہئے اور وہ غالباً یہ ہے کہ فراق چونکہ سنسکرت نہیں جانتے اس لئے انھوں نے "ہند و عورت کا تصور" ہندی تصانیف سے لیا ہے اور ہندی ہی میں کالیداس، بھوبھوتی، اور بھرتری ہری وغیرہ کی شاعری کے نمونے دیکھے ہوں گے تاہم اگر وہ مثال میں ترجمے ہی پیش کردیتے تو بھی غنیمت تھا، لیکن انھوں نے یہ بھی نہیں کیا، کیونکہ میری طرح وہ بھی جانتے ہیں کہ کالیداس اور بھوبھوتی وغیرہ کی عشقیہ شاعری میں بھی جنسی غلبہ کے سوا کچھ نہیں، لیکن اس کا کیا علاج کہ وہی چیز جو اُردو شاعری میں ان کے نزدیک یکسر شہوانی و جنسی ہے وہی چیز انھیں ہندی شاعری میں پختگی، پاکیزگی اور رچاؤ نظر آتی ہے - فراق نے ظلم غریب اُردو پر ہی نہیں کیا بلکہ انگریزی زبان و ادب پر بھی کیا ہے - فراق نے اسی مضمون کے صفحہ ۷۰ پر ظاہر کیا ہے کہ:-

"انگریزی زبان کے کئی چوٹی کے شاعروں نے عشقیہ شاعری کی ہی نہیں جیسے ملٹن، ورڈسورتھ، کولرج، شیلے، کیٹس، میتھو آرنلڈ وغیرہ"

حیرت ہے کہ وہ انگریزی زبان کا پروفیسر ہوتے ہوئے یہ دعوے کرتے ہیں کہ شیلی اور کیٹس رومانی دور کے شاعر نہ تھے؟ میں فراق سے ان تمام مذکورہ بالا انگریزی ادب کے شعراء کے بارے میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا انھوں نے دنیائے عشق میں قدم نہیں رکھا؟ کیا انھوں نے عشقیہ شاعری نہیں کی؟ وہاں اگر فراق یہ لکھتے کہ انگریزی ادب کے ان شاعروں نے کمتر درجہ کی عشقیہ شاعری کی تو بھی ایک بات تھی مگر یہ بھی اسی وقت کہی جا سکتی تھی جبکہ وہ انگریزی شاعروں کے مقابلہ میں سنسکرت کی شاعری کے نمونے پیش کرتے۔ کیٹس (Keats) کی عشقیہ شاعری سے منکر ہونا حقیقت کا انکار ہے، کیا کیٹس کے متعلق یہ روایت مشہور نہیں کہ اس نے اپنی محبوبہ کے عشق میں اپنی جان دیدی؟ اگر یہ روایت قابل اعتبار نہیں تو کیا وہ اس سے بھی انکار کریں گے کہ اس نے فینی برؤان (Fanny Brawne) سے عشق نہیں کیا؟ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنے عشق کو پروان نہ چڑھا سکا تاریخ ادب انگریزی مرتبہ گینز اسین کا یہ جملہ ملاحظہ ہو:-

"His last months were darkened by Hopeless Love"

ترجمہ = اس کی (کیٹس) زندگی کے چند آخری مہینے عشق میں ناکامیابی کی وجہ سے اس کے لئے بہت تاریک ہو گئے تھے۔

فراق کو کیٹس کے کلام میں سنسکرت کی پاکیزگی اور رچاؤ کہاں سے نظر آتا جبکہ ان کے نزدیک اس نے کسی سے محبت ہی نہیں کی تھی؟ اور یہ سانیٹ شاید کسی اور کا ہے۔

"No, yet still Steadfast, Still unchangeable,
Pillowed upon my fair Loves ripening breasts,
To feel for ever its soft fall and Swell
Awake for ever in a sweet unrest.
Stell, Still to hear her tender Take-breath
And so live ever-or else swoon to death."

ترجمہ = نہیں اب بھی اسی طرح مستقل اور ابدالآباد کے لئے لاحدوث ہو کر ـــــ اپنی محبوبہ کے گدرائے ہوئے سینوں پر سر رکھ کر ـــ ہمیشہ کے لئے اس کے سینوں کا اُتار چڑھاؤ محسوس کرتے ہوئے ـــ خوشگوار مگر اضطرابی کیفیت کے ساتھ ہمیشہ جاگتا رہوں ـــ ہمیشہ ہمیشہ اسکے نازک سانس کو سنتے ہوئے اور اسی طرح زندہ رہوں ورنہ بیخبر موت کا جام پی لوں۔

کیا وہ آفاقی لپس منظر جو فراق کو صرف سنسکرت کی شاعری میں نظر آتا ہے مذکورۂ بالا اقتباس میں نظر نہیں آتا؟ ہے کہ فراق یہ کہیں کہ اس میں محبت نہیں، عشق نہیں بلکہ ہوا و ہوس کی بو آتی ہے یہ جنسی جذبات کا حامل ہے مگر

دوسری نظم "The dark Lady's Song" کے متعلق کیا کہیں گے؟

"To Sorrow
I bade good morrow
And thought to leave her far away behind
But cheerly, cheerly,
She is so constant to me and so kind,
I would deceive her
And so leave her
But Ah! She is so constant and so kind."

ترجمہ: غم کو — میں نے الوداع کہا — اور اس کو پیچھے چھوڑ دینے کا خیال کیا — لیکن بڑی خوشی کے ساتھ — وہ مجھے دل و جان سے پیار کرتی ہے — وہ میرے ساتھ اس قدر مستقل اور مہربان ہے — میں اس کو دھوکا دوں گا — اور اس لئے چھوڑ دوں گا — لیکن افسوس! وہ نہایت لاحدوث ہے اور اس قدر مہربان ہے۔

محبت اور اس کا اعتراف اس میں موجود ہے اور یہ وہ محبت ہے جس میں دل و جان کی بازی لگائی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ادنیٰ درجہ کی عشقیہ شاعری ہو مگر ہے تو عشقیہ شاعری؟ اور یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ کیٹس نے عشقیہ شاعری سرے سے کی ہی نہیں۔ اس کی ایک اور نظم Isabella کا ایک بند ملاحظہ ہو:-

"O Isabella! I can half perceive
That I may speak my grief into thine ear
If thou but listen the while: listen then
My soul is to its doom: I would not grieve
Thy hand by unwelcoming pressing, would not fear
Thine eyes by gazing, but I cannot live
Another night, and not my passions shrive"

ترجمہ: "او ایشا بیلی! میں کچھ خیال کر سکتا ہوں — کہ میں تیرے کانوں تک اپنا رنج و غم پہونچا دوں — یقین جان میں تجھ سے کتنی محبت کرتا ہوں، باور کر میں کس قدر نزدیک — میری روح منتہائے فنا پر ہے

میں افسوس نہیں کروں گا ــــ تیری رضامندی کے بغیر تیرا ہاتھ دباتے ہوئے خائف نہیں ہونگا۔
تیری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے لیکن میں زندہ نہیں رہ سکتا ــــ دوسری رات تک اور میرے
جذبات قایم نہیں رہ سکتے۔"

اس کی ایک اور نظم (Endymion) ہے جو جذبات اور احساسات کی بلندی کے لحاظ سے
صدرجہ قابل داد ہے اس کے علاوہ میں جناب فراق سے یہ بھی درخواست کروں گا کہ وہ اس کی دوسری نظمیں
The Eve of St. Agnes اور La Belle Dame Sans Merci
بھی ملاحظہ فرمائیں تاکہ انھیں کیٹس کی عشقیہ شاعری کا صحیح اندازہ ہوجائے۔

شیلی (Shelley) کے متعلق بھی فراق نے یہی لکھا ہے کہ اس نے عشقیہ شاعری سرے سے کی ہی
نہیں۔ فراق نے شیلی کے حالات زندگی میں یہ ضرور پڑھا ہوگا کہ شیلی کو (Harriet West Brook)
سے لگاؤ تھا اور بعد میں اس سے شادی بھی کرلی تھی، فراق نے وہ نظمیں بھی دیکھی ہوں گی جو اس نے اپنی اس
محبوبہ دلنواز پر لکھی ہیں اور کیا فراق اس سے انکار کرسکتے ہیں کہ اس نے اپنی نئی معشوقہ سے تعلقات قایم نہیں کئے؟
کیا اس کی پہلی محبوبہ نے خودکشی نہیں کی؟ کیا شیلی نے اپنی دوسری شادی نہیں رچائی؟ کیا اس نے Emilia
Viviane سے محبت کا رشتہ نہیں جوڑا؟ کیا اس نے اپنی شاعری میں عورت کو بلند ترین مرتبہ نہیں دیا؟
سب سے پہلے اس کی نظم فلسفہ محبت (Love's Philosophy) ملاحظہ ہو:-

"The fountains mingl with the River
An the Rivers with the ocean,
The winds of Heaven mix for ever,
With a sweet emotion;
Nothing in the World is single;
All things by a law Divine
In one another's being mingle
Why not I with thine?

See the mountains kiss high Heaven
And the waves clasp one another
No sister flower would be forgiven

If it disdained its brother,
And the sunlight clasps the earth
And the moon leans kiss the Sea:
What are all these kissings worth,
If thou kiss me not?"

ترجمہ بند اول = چشمے دریا سے ملتے ہیں — اور دریا سمندر سے — جنّت کی ہوائیں ہمیشہ ملتی رہتی ہیں۔ شیریں جذبات کے ساتھ — دُنیا میں کوئی تنہا نہیں ہے — تمام اشیا ایک قانون کی رو سے غیر فانی ہیں — ایک دوسرے سے ملکر — پھر میں کیوں نہ تجھ سے مل جاؤں؟

ترجمہ بند دوم = پہاڑوں کو فلک بوس ہوتے دیکھتا ہوں — اور لہریں ایکدوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ کوئی قریبی پھول معاف نہیں کیا جائے گا — مگر اس نے اپنے رفیق کو نظر انداز کیا — دھوپ زمین سے گلے ملتی ہے — اور چاند کی کرنیں سمندر کا بوسہ لیتی ہیں — ان تمام بوسوں کی حقیقت کیا ہے۔ اگر تو مجھے پیار نہ کرے۔

یہ ہے شیلی کا بلند فلسفہ محبت جو دنیا کی ہر شے کو محبت کے ایک عالمگیر قانون کا پابند دیکھتا ہے۔ شیلی کا نظریہ یہ ہے کہ محبت شجر و حجر تک میں موجود ہے، دُنیا کی تخلیق کا سبب ہی عشق ہے چنانچہ Epipsychidion کی مندرجہ ذیل سطور ملاحظہ ہوں:-

"All-singing loud, 'Loves very pain is sweet
But its reward is in the world Divine,
Wheet, if not here, it builds beyond the grave.

ترجمہ = سب بلند آواز سے گاتے ہیں عشق کا سوز شیریں ہوتا ہے — لیکن اس کا پھل حقیقی یا غیر فانی ہوتا ہے۔ جو اگر یہاں نہیں تو قبر کے بعد غیر فانی ہو جاتا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ اول اول شیلی کی محبت جنسی یا محض شہوانی تھی مگر بعد میں وہ اس راز کو پا گیا جو محبت میں ورائیت پیدا کر دیتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ فراق صاحب کو شیلی کے یہاں ادنیٰ قسم کی بھی عشقیہ شاعری کہیں نہیں ملتی۔

کولرج کا فلسفہ محبت زیادہ بلند نہیں پھر بھی محبت کی چھپی ہوئی چنگاریاں اور برما دینے والے جذبات اس کی شاعری میں جگہ جگہ نمایاں ہیں صرف شاعری ہی نہیں بلکہ نثری خطوط میں بھی اس نے محبت بھرے جذبات پیش کئے ہیں

وہ تمام خطوط آج اس کی شہادت دیں گے جو اس نے اپنی بیوی کے نام لکھے ہیں۔ ان میں کیسا رومان اور کیسے پرسوز جملے لکھے ہیں معلوم ہوتا ہے محبت کا طوفان موجوں کو ہم آغوش کئے بڑھتا چلا آرہا ہے کولرج کا فلسفۂ عشق ذیل کی سطور سے بخوبی ظاہر ہوگا:۔

"All thoughts, all passions, all delights,
Whatever stirs this mortal frame
All are but ministers of love,
And feed his sacred flame."

ترجمہ:۔ تمام خیالات تمام جذبات اور تمام مسرتیں —— جو اس فانی جسم کے خادم ہوتے ہیں ——
سب محبت کے خادم ہوتے ہیں —— اور اس پاک شعلے کی غذا بن جاتے ہیں۔

فراق نے ملٹن کی عشقیہ شاعری سے بھی انکار کیا ہے حالانکہ ملٹن نے بھی ایک آہو چشم دوشیزہ کو اپنے دل میں جگہ دی تھی اور دوشیزہ کے حسن کی تعریف اس نے اُن سانیٹ میں کی ہے جو اس نے اطالوی زبان میں لکھے ہیں اور جو بہ لحاظ جذبات بہت بلند ہیں میں فراق صاحب کو ملٹن کی اس نظم کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے:۔

"Me thinks I saw my late espoused saint"

اس نے ایک تمثیلی نظم بھی Samson — Agoniste کے عنوان سے لکھی ہے اور اس پوری نظم میں محبت اور عشق کے نشیب و فراز بڑے اہتمام سے دکھائے ہیں! فراق صاحب اسے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اب ورڈسورتھ کو لیجئے۔ اس نے جب دُنیاداری سیکھی تو انقلاب فرانس کی انتہا تھی، وہ خود وہاں پہونچا اس نے وہاں ایک دوشیزہ کو منظورِ نظر بنایا۔ اس سے ایک لڑکی بھی ہوئی کیمبرائین کی تاریخ ادب انگریزی کے صفحہ ۱۰۳ پر ذیل کی سطور درج ہیں:۔

"And the trouble left in his soul by his passion for a young French girl, Annette Vallon — whose daughter he recognised but whom he believed he could not marry."

ترجمہ:۔ اس کو جو روحانی تکلیف باقی تھی وہ اس فرانسیسی جوان لڑکی کی محبت کی وجہ سے تھی جس کا نام

آئنٹ ویٹیلون تھا جس کی بیٹی کو اس نے اپنی اولاد بتایا مگر وہ اس سے شادی نہ کر سکا۔"

اس کو ورڈسورتھ کی ادنی درجہ کی محبت کہا جائے یا عشق مجازی، مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ محبت سے بالکل ناآشنا تھا، کیا فراق نے اس کی Lucy Poems نہیں پڑھیں وہ اپنی ایک نظم "She dwelt among untrodden ways" میں اپنی محبت کا اظہار اس طرح کرتا ہے

"She lived unknown and few could know
When Lucy ceased to be
But she is in her grave and oh!
The difference to me."

ترجمہ = اس نے گوشۂ تنہائی میں زندگی گزاری ـــــ اور کب لوسی ختم ہو گئی ـــــــ

لیکن وہ اپنی قبر میں موجود ہے اور ہائے ـــ کتنا فرق میرے لئے ہے؟

اس کی ایک اور نظم عشقیہ جذبات کی حامل نظر آتی ہے "Why art thou silent?"

مگر اتنا ضرور لکھنا پڑے گا کہ ورڈسورتھ کی عشقیہ شاعری بہت کم ہے، وہ فطرت اور قدرت کا شاعر تھا اس وجہ سے اس نے اپنا تمام تر زور منظر نگاری پر صرف کیا۔

میتھو آرنلڈ کی عشقیہ شاعری مارگریٹ نظموں میں ملتی ہے ان میں اس ماہوش کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کو آرنلڈ نے چاہا اگر بلند ترین عشقیہ جذبات تلاش کرنا ہوں تو اس کی یہ نظم پڑھی جائے "The Buried Life" وہ یوں لکھتا ہے:-

"Alas, is even love too weak
To unlock the heart and let it speak?
Are even lovers powerless to reveal
To one another what indeed they feel?
I know the mass of men conceal
Their thoughts; for fear if they revealed
They would by other men be met.
With blanks indifference or with blame reproved.

ترجمہ = افسوس کیا عشق اس قدر کمزور ہوتا ہے ـــ کہ دل کے قفل کو نہیں کھول سکتا اور اس طرح کہ

اس کو اظہار جذبات کا موقع دے ـــ کیا عشاق اس قدر کمزور ہوتے ہیں کہ وہ ظاہر نہیں کر سکتے۔
ایک دوسرے کے روبرو جو وہ محسوس کرتے ہیں ـــ میں جانتا ہوں کہ دنیا چھپاتی ہے ـــ
اپنے خیالات، کیونکہ اگر وہ ظاہر کر دئے جاتے ہیں ـــ تو دوسرے آدمیوں کی طرف سے ـــ
ان پر کوئی توجہ نہیں ہوتی یا پھر ان پر الزام عاید کئے جاتے ہیں۔

وہ دنیا کی اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ عشاق اگر اپنے جذبات ظاہر کرتے ہیں تو وہ قابل توجہ نہیں سمجھے جاتے اور اگر کوئی ان کی طرف متوجہ بھی ہوتا ہے تو عاشق و معشوق دونوں مجرم ٹھیرائے جاتے ہیں گویا عشق ان کی نظروں میں سماجی گناہ ہے، وہ محبت کے نتائج کو ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:-

"Love lends life a little grace
A few sad smiles; and then
Both are laid in one cold place
In the grave."

ترجمہ = محبت زندگی میں رعنائی پیدا کر دیتی ہے ـــ اور چند پُرسوز مسکراہٹیں اس میں اضافہ کر دیتی ہیں اور قلب ـــ دونوں کو ایک ٹھنڈی جگہ کے سپرد کر دیتی ہے ـــ قبر میں۔

مجھے حیرت ہے کہ ان مثالوں کے ہوتے ہوئے بھی فراق یہ دعوے کرتے ہیں کہ ان شاعروں نے نہ محبت کی اور نہ عشقیہ شاعری۔

فراق کے اس مقالہ کے دوسرے پہلوؤں میں آیندہ بحث کروں گا۔ اویس احمد ادیب ایم اے

(اسٹالین کی زباندانی)

مارشل اسٹالین سوائے روسی زبان کے کوئی اور زبان نہیں جانتا لیکن انگریزی کے چھ الفاظ اسے ضرور معلوم ہیں۔ ایک دوسرے ملک کے سفیر سے اس کی گفتگو ملاحظہ ہو:-

سفیر = " مارشل، کیا آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں ـــــــ "
اسٹالین = " نہیں "
سفیر = " لیکن آپ مجھے اس کی اجازت تو دیں گے کہ میں ـــــــ "
اسٹالین = " نہیں، نہیں "
سفیر = " مارشل تو کیا میں امید رکھوں کہ آپ ـــــــ "
اسٹالین = " نہیں، نہیں، نہیں "

اُردو ادب میں طنز و مزاح

طنز و مزاح کیا ہے یوں تو زندگی حقیقتاً غم کی صدائے بازگشت ہے۔ لیکن اگر حیات کی حقیقتیں اسی حد تک محدود رہتیں تو زندگی تلخ تر ہو جاتی۔ ہم اس کشاکش کو وقتی طور پر بھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور رات کے مانند سیاہ زندگی کبھی کبھی دن کی طرح منور نظر آنے لگتی ہے۔ یہ نور ان خوشی کے جذبوں کا ہے جو فطرت نے ہماری غم زدہ سرشت میں شامل کر دیا ہے۔ اور یہ ہنسی کیوں پیدا ہوتی ہے؟ ۔ کائنات کی نامکمل اشیا کے بے ڈھنگے پن پر جہاں ہر شے موزوں اور مکمل نظر آئے گی ہنسی ہمارے ہونٹوں پر نہ کھیل سکے گی۔ دوسروں کی کمزوریوں پر ہنسنا ہماری فطرت میں داخل ہے۔ اور کمزوریوں سے کائنات کی کوئی شے خالی نہیں ہے۔ اسلئے ہنسی ہماری زندگی کا لازمی جزو بن گئی ہے ـــــ کائنات کے ادھورے پن پر کبھی ہم صرف "اظہار خیال" کر کے رُک جاتے ہیں اور کبھی "اظہار خیال" کے ساتھ ساتھ اُن ناتمامیوں کو دور کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ محض اظہار خیال کو ہم ظرافت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ ہمارا ظریفانہ ادب ہوتا ہے مگر جس ادب اظہار خیال کے ساتھ ساتھ ان نقایص اور ناتمامیوں کو دور کرنے کی کوشش بھی شامل ہوتی ہے اسے ہم طنزیہ ادب کہتے ہیں۔

ادب زندگی کا ترجمان ہے۔ زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا، بڑھتا اور سنورتا رہتا ہے۔ زندگی کے اُتار چڑھاؤ ادب میں بھی اُتار چڑھاؤ پیدا کر دیتے ہیں۔ اس لئے ادب غم واندوہ کے ساتھ ساتھ مضحکہ خیزی کا بھی ترجمان ہے۔ انسانی دماغ خستگی کے بعد تھوڑا سا سکون چاہتا ہے۔ اور یہ سکون مختلف ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ انھیں میں سے ایک ذریعہ مزاحیہ ادب بھی ہے۔ "ہنسی عموماً طمانیت اور تسکین کا صوری اظہار ہے۔ اس اظہار کی تہیں اور مدارج مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ان سب کا سرچشمہ ایک ہی ہوتا ہے" اور اسی سرچشمے سے ظریفانہ ادب پیدا ہوتا ہے۔ ظرافت نگار ایک بے لوث مشاہدہ کر کے اس سے خود محظوظ اُٹھاتا ہے اور پھر اُسے صفحۂ قرطاس پر لا کر دوسروں کے لئے سرمایہ انبساط پیدا کرتا ہے۔

طنزیہ ادب محض ہنساتا ہی نہیں بلکہ اس کی تہ میں حزن کا ایسا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے جو آنکھوں میں آنسو لائے بغیر نہیں رہتا۔ طنز نگاری جب ذاتیات اور بغض وعناد سے متعلق ہوتی ہے تو وہ ہجو بن جاتی ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی "بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد اور تعصب سے پاک ہو اور ذہن و فکر کی

بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔" طنز نگار محض ہنستا نہیں ہے بلکہ اسے رونا بھی پڑتا ہے۔ وہ ہمدردی، انصاف اور رحم کے ساتھ ساتھ غصہ، بغض اور حقارت کے جذبات کو ہیجان میں لاتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول کا استہزا کرتا ہے۔ وہ ایک منظر کو دور سے کھڑا ہو کر دیکھتا ہے اور ہنستا ہے۔ پھر اُسی کو تحریر کے سانچوں میں ڈھال کر دوسروں کو ہنسنے کی دعوت دیتا ہے۔ "طنز نگار ظرافت نگار کے علاوہ اور بھی کچھ ہے، مگر ظرافت نگار محض ظرافت نگار ہے"، طنز نگار ہماری سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کر کے ہم میں زندگی کی تازہ روح پھونک دیتا ہے۔ طنز نگار انسانی کمزوریوں اور لغزشوں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ اس طرح وہ سماج اور ملک کی عظیم خدمت انجام دیتا ہے۔ طنز نگاری کا حربہ دیگر نگارشات سے زیادہ کامیاب اور موثر ثابت ہوتا ہے۔ سنجیدہ ادب کے ساتھ ساتھ ظریفانہ ادب بھی منازلِ ارتقا طے کرتا رہتا ہے اور ایک بلند سطح پر پہونچکر طنز کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی ظرافت کا تعمیری ادعا ہے الغرض "ظرافت کی عام اور عالمگیر حقیقت ہر جگہ موجود ہے خواہ ادب برائے ادب ہو خواہ ادب برائے زندگی۔ ظرافت موقع محل کے لحاظ سے مختلف صورتیں اختیار کر لیتی ہے کہیں تبسم زیر لب، کہیں خندہ دنداں نما اور کہیں قہقہہ"۔

سماجی اور معاشرتی حالات نے ہمارے ادیبوں کو غم زدہ اور برداشتہ خاطر بنا دیتا ہے، اور یہی رنگ انکی تحریروں میں نمایاں ہوتا ہے کم و بیش ہمارے سارے ادب میں ایک غمگین کیفیت دوڑی نظر آتی ہے۔ انھیں وجوہات کی بنا پر اُردو ادب میں بڑی حد تک مزاحیہ ادب کا فقدان رہا ہے۔ البتہ ریختی کو ہم ظریفانہ ادب میں شمار کر لیں تو کمی کسی حد تک پوری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بہر حال ریختی ہمارے لئے مزاح کا سامان پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ جب ایک شاعر خود کو عورت کے لباس پیش کر کے اُسی زبان اور اسی لہجہ میں شعر کہتا ہوگا تو یقیناً سننے والوں کو ہنسی آتی ہوگی۔

ریختی کے بعد ظرافت کی ایک قسم ہمیں زٹل کے نام سے ملتی ہے۔ جس کے لئے جعفر زٹل کا نام اب تک مشہور ہے۔ انھوں نے اس طرز کو اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ کسی کی ہجو کر دی تو کسی پر پھبتی اُڑا دی اور ہر دل سے کچھ حاصل کر لیا۔ وہ جو کچھ لکھتے سب انعام اور اکرام کی خواہش میں۔ بہر حال وہ اپنے زمانہ میں بہت مشہور ہزل گو تھے۔ ملا عبدالقادر بیدل کے ہمعصر تھے۔ جس سے روٹھ جاتے تھے اس کا خاکہ اُڑائے بغیر نہ رہتے تھے۔

کم و بیش اسی دور میں جان صاحب، میر ضاحک، ناجی وغیرہ اپنی ظرافت میں مشہور ہوئے۔ رنگین اور [illegible]، مرزا سلیمان شکوہ کے ہم عصر تھے۔ یہ لوگ ظرافت میں موجد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر ان کی ظرافت میں ابتذال [illegible] کو بہت دخل ہے۔ داخلی رنگ پوری طرح رچا ہوا ہے۔ رعایت لفظی اور ایہام کی بھرمار ہے۔ چرکین شعار اور ملا وہ پیازہ کے لطیفوں نے بھی ہنسنے ہنسانے کا بہت سامان مہیا کیا ہے۔ حالانکہ افادی نقطۂ نظر سے

ان کی ظرافت قطعی غیر معیاری ہے۔

شاہ حاتم پہلے شاعر ہیں جنھوں نے خوبصورتی سے ظرافت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ریختی ٹائپ اور ایہام گوئی سے ہٹ کر خالص ظریفانہ اشعار کہے لیکن ظرافت کے حقیقی مقام کے تعاقب میں وہ بھی پیچھے رہ گئے۔

اس کے بعد سودا سے قبل کوئی نام سنائی نہیں دیتا ہے۔ سودا کا نام قدیم ظرافت نگاروں کی سرفہرست رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن سودا کی ظرافت کی بنیاد محض ہجو نگاری پر تھی۔ ہجو سے ہٹ کر معیاری ظرافت میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ ان کی ہجو نگاری نے اُردو پر دیرپا اثر ڈالا۔ مگر ان کا تتبع کوئی نہ کر سکا۔

سودا کی ہجویات زیادہ تر ذاتیات پر مبنی ہوتی ہیں ان کے پیشِ نظر کوئی بڑا مقصد نہیں ہوتا تھا لیکن غیر شعوری طور پر ان کی ظرافت میں کہیں کہیں وہ طرز نگارش پیدا ہو گیا ہے جو طنز یہ ادب کی جان ہے۔ یہ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ سودا کو ہجو نگاری پر کس چیز نے مائل کیا مگر یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ چیز فارسی ادب سے لی ہے۔ بہر حال انھوں نے اس طرز کو اُردو میں بہت عروج دیا۔ مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں "گرمی کلام کے ساتھ ساتھ ظرافت جو ان کی زبان سے ٹپکتی تھی اس سے صاف ظاہر ہے کہ بڑھاپے تک شوخیِ طفلانہ اُن کے مزاج میں اُمنگ دکھاتی تھی۔"

سودا بہت ہی حساس واقع ہوئے تھے۔ جب کبھی کسی کا کوئی فعل ان کی طبع نازک پر گراں گزرتا وہ ضرور کچھ نہ کچھ لکھ ڈالتے اور اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔ ان کی اس ہجو نگاری سے سب ہی خائف تھے لیکن اس سے ہٹ کر ہم کو ایسی بھی نظمیں ملتی ہیں جن کا شمار ان کی طنزیات میں ہوتا ہے۔ ان میں "قصیدۂ شہر آشوب" "تضحیک روزگار" بہت مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی نظمیں ہیں جن میں جگہ جگہ سماج کی خستہ حالی اور زبوں کا نقشہ کھینچا ہے اور جن کے پڑھنے سے اس وقت کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ اس زمانہ میں دلی بد انتظامی اور انتشار کا مسکن تھی۔ مغل صرف نام کے بادشاہ تھے۔ حکام رشوت لیتے تھے۔ اس کا نقشہ سودا اس طرح کھینچتے ہیں:-

کیا ہوا یارو وہ نسق ہیہات،
لیموں کے چور کا کٹے ہے ہاتھ

باندھا جاوے تھا چور پگڑی کا
مارا جاوے تھا دزد لکڑی کا،

شہر میں کیا رہے تھا امن و اماں
کیسی کرتی تھی خلق خوش گزراں

تھانہ رشوت سے کوتوال کو کام،
شہر میں تھا نہ جوئے کا کہیں نام

مگر یہ حالت بہت جلد تبدیل ہو گئی۔ اور یہاں تک کہ حکام نے لٹیروں سے مل کر کام شروع کر دیا جس سے ان کی

آمدنی بڑھ گئی اور چوروں نے وہ آفت ڈھائی کہ خدا کی پناہ :۔

اب جہاں دیکھو واں جھجکا ہے — چور ہے ٹھگ ہے اور اُچکا ہے
خاص بازار کا جو سنئے بیان — ان کے نزدیک کاٹ ڈالے کان
دمڑی کے سودے کو جو واں جاوے — پگڑی کھوسر کو پٹیا آوے

کس طرح شہر کا نہ ہو یہ حال — شیدی فولاد اب جو ہے کوتوال
ان سے رشوت لئے یہ بیٹھا ہے — اس کے دل میں یہ چور بیٹھا ہے

مگر سودا کا بیشتر کلام اتنا فضول اور فحش ہے کہ ہمارے کان ان اشعار کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ مگر پھر بھی واقعہ نگاری نے ان کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ سودا کا طرز بیان لبوں پر مسکراہٹ پیدا کرتا ہے مگر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ سودا کے معاصرین میں فدوی، مکین، بقا وغیرہ ہیں یہ لوگ اسی میدان میں اُترے مگر سودا کی گرد کو بھی نہ پہونچ سکے اس کے باوجود سودا کا وہ بلند مقام نہیں جس کی ان سے امید تھی۔ انھوں نے اس زمین میں بیشتر گلہائے تازہ کھلائے مگر وہ مبالغہ کے تصرف سے واقف نہ تھے اور یہی مبالغہ نگاری ان کے کلام کا بڑا عیب سمجھی جاتی ہے، سودا طنز کی بہ نسبت ظرافت سے زیادہ متاثر ہیں اور ظرافت سے زیادہ ہجو نگاری سے مغلوب ہیں۔ بقول آزاد "ان کے دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ وہ خود ہنستے تھے اور دوسروں کو بھی ہنسا سکتے تھے" پھر ایسے شاعر سے ہم ظرافت کے علاوہ اور امید بھی کیا کر سکتے تھے۔ سودا کی مزاح نگاری بڑی حد تک زہر خند سے مشابہ ہے۔ میر حالانکہ قنوطی تھے۔ آنسوؤں کے دریا میں ہر گھڑی غوطے کھاتے رہتے تھے لیکن وہ بھی کہیں کہیں ایسے اشعار لکھ گئے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ مثلاً :۔

آدمی جو بڑے کہاتے ہیں — مرغ مارے بغل میں آتے ہیں

مرغ کی ایک پرفشانی ہے — ان کی صد رنگ بد زبانی ہے

ظرافت کی یہ بنیادیں اگرچہ مستقبل کی ضمانت دار نہیں تاہم ان سے اصلاح اور نشوونما کی ایک امید ضرور تھی لیکن بعد کو ماحول نے اُسے منقلب کر دیا۔ مبتذل اور رکیک خیالات کی گرم بازاری ہو گئی۔ شاعرانہ چشمکوں، ذاتی مخالفتوں نے دماغی توازن کو بگاڑ دیا اور ظرافت سے سنجیدگی کا عنصر بالکل اُٹھ گیا۔ جرأت، مصحفی، انشا اور رنگین سب باہمی شخصی جنگ میں کھو گئے — ان ذاتیاتی کشمکشوں سے ادب کو بہت نقصان پہونچا۔ جرأت ظریف اور ستم ظریف دونوں تھے مگر ادب میں انھوں نے کوئی دیرپا نقوش نہیں چھوڑے۔

کم و بیش اسی زمانہ میں لکھنؤ کے معاشرتی اور سماجی حالات بدلنے لگے اور مزاح نگاری کے لئے ایک

خوشگوار فضا پیدا ہوگئی اودھ کی نوابی کا خورشید نکل رہا تھا۔ اس عہد میں وہ خصوصیات موجود تھیں جو عہدِ شباب میں ہوتی ہیں۔ امرا اور نوابین رنگ رلیاں مناتے تھے۔ شوقین مزاج ہر طرف تھے اور یہی شوقین مزاجی مزاحی ادب کی سرپرستی کا باعث بن گئی۔ اس ادب میں کوئی افادیت نہیں کیونکہ یہ محض ہنسنے ہنسانے کی خاطر تھا۔ اس ظریفانہ ادب میں تکلف اور تصنع بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔ 'بازاریت' کے عناصر بھی پوری طرح نمایاں تھے۔

انشا اور مصحفی نے اسی دور میں پرورش پائی۔ بقول آزاد "ان کا ایک ایک مصرع قہقہہ کا منتر ہے۔ لیکن آج اگر انھیں کوئی لکھ بھی دے، تو عدالت یا انصاف میں مجرم ہو کر جواب دہی کرنی پڑتی ہے۔" مگر اس زمانے میں انشا کی بذلہ سنجی اور ظرافت کی ہر طرف دھوم تھی وہ محض ظرافت کے لئے پیدا ہوئے تھے اور وہ بات بات میں مزاح پیدا کرنے پر کامل قدرت رکھتے تھے۔ چند اشعار سنئے:۔

صنم خانے میں جب دیکھا بت و ناقوس کا جوڑا — لگا ٹھاکر کے آگے ناچنے طاؤس کا جوڑا

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کنڈ پر — اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر

خیال کیجے کہ کیا آج کام میں نے کیا — جب اس نے دی مجھے گالی سلام میں نے کیا

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا — جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا

مگر انشا کے طنز میں گہرائی نہیں ہے۔ انداز بیان ضرور رنگین ہے مگر یہ رنگینی بیشتر پھکڑ پن تک پہونچ جاتی ہے۔ البتہ انشا کی ظرافت اور نفسانی زندگی میں بڑی حد تک ہم آہنگی ہے۔

انشا نے اپنی ظرافت کا نشانہ زیادہ تر مصحفی کو بنایا ہے۔ ظرافت مصحفی کے بس کا کام نہ تھی مگر پھر بھی معاصرانہ چشمکوں سے مجبور ہو کر انھوں نے ہجو نگاری شروع کی۔ لیکن حتی الوسع گندے مضامین سے احتراز کیا۔ انکا انداز بیان ضرور شگفتہ ہے۔ لیکن وہ بات کہاں جو انشا کے یہاں ملتی ہے۔ چند اشعار سنئے:۔

کیوں نہ دل نظارگی کا جائے لوٹ — لکھنؤ میں حسن کی بندھی ہے لوٹ

اس کے در پر میں گیا سوانگ بنائے تو کہا — چل بے چل دور ہو کیا لے کے فقیری آیا

سرگرم سیرِ گلشن کیا خاک ہوں کہ اپنا — نرلے سے ہو رہا ہے آپ ہی دماغ ٹھنڈا

اسی دور میں ہمیں نظیر اکبر آبادی کا نام دکھائی دیتا ہے جس نے ادب سے ذاتیات کو بالکل نکال دیا اور سماجی حالات کو منقلب کرنے کے لئے اُردو میں عوامی شاعری کی بنیاد ڈالی۔ سنئے:۔

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیہ سے — یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے

وہ سُن کے بولا بابا خدا تجھ کو صبر دے — ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے

بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ظریفانہ شاعری میں واقعیت کی داغ بیل نظیر اکبر آبادی نے ڈالی ہے۔

اس کے بعد ظریفانہ شاعری مختلف سانچوں میں ڈھلتی رہی۔ روایاتی خیالات اُٹھنے لگے اور اس کی جگہ حقیقت پر زیادہ زور دیا جانے لگا، اب سودا کی قدر نہ تھی۔ بلکہ غالب کی بذلہ سنجی کا سکہ جما ہوا تھا۔

اُردو میں برجستہ اور بے تکلف نثر کا نمونہ سب سے پہلے غالب کے یہاں ملتا ہے۔ بذلہ سنجی اور شوخی ان کی طبیعت کا جزو لاینفک ہے۔ ان کی نگارشات میں روانی اور بے تکلفی ہے، تصنع اور آورد نام کو نہیں۔ غالب کو ہم حالی کے لفظوں میں "حیوانِ ظریف" کہہ سکتے ہیں۔ غالب کی طبیعت میں مزاح کا رنگ پوری طرح رچا ہوا تھا۔ بقول حالی "مرزا کی طبیعت میں شوخی اس طرح بھری ہوئی تھی جیسے ستار میں سُر"۔ مثلاً ایک خط میں غالب لکھتے ہیں:

"سب روٹی کھاتے ہیں اور میں کپڑا کھاتا ہوں"

غالب کے بعد پھر کچھ عرصے تک ہمارے ادب میں مزاح نگاری کا فقدان رہا۔ غدر کی شورشیں دب چکی تھیں اور سیاسی، سماجی، معاشرتی حالات بھی بدلنے لگے تھے، اس وقت اصلاح کی کوششیں ہو رہی تھیں، مگر دلوں پر غم واندوہ کے اثرات باقی تھے۔ سرسید، آزاد، محسن الملک، وقار الملک، ذکاء اللہ وغیرہ نے ادب میں گرانقدر اضافے کئے مگر وہ سب مزاح اور طنز نگاری سے دور رہے۔ البتہ حالی کے یہاں طنز نگاری کے جستہ جستہ نمونے مل جاتے ہیں اور شبلی کی دو ایک نظمیں طنز کا اچھا مواد بہم کرتی ہیں۔

حقیقی مزاحیہ ادب کا آغاز نذیر احمد سے ہوتا ہے۔ ان کی ظریفانہ نگارشات میں ایک سنجیدہ بے تکلفی ہے اُن کی ظرافت بہت لطیف اور سادہ ہوتی ہے۔ پھکڑپن کو مطلق دخل نہیں۔ ان کی ظرافت کی گہرائیوں میں طنز پوشیدہ ہے۔ ابن الوقت میں انگریزی طرز معاشرت کی تقلید پر گہرا طنز ہے۔

محمد حسین آزاد کے طرز میں بھی جدید ظرافت کا پرتو جھلکتا ہے۔ آب حیات میں جہاں شعرا کا تذکرہ ملتا ہے وہیں ایک سنجیدہ ظرافت بھی جھلکتی ہے۔

دوسرا دور زندگی کے انقلابوں کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی انقلاب پیدا ہونے لگا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ مزاح کا رنگ بھی نئے سانچوں میں ڈھلنے لگا۔ طنز نگار سماجی کمزوریوں پر بے لاگ تنقیدیں کرنے لگے۔ خود بینی اور تعصب و عناد کی جگہ وسیع النظری اور نیک نیتی نے لے لی۔

اسی زمانہ میں مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے اکبر سینہ سپر ہوئے اور طنز کے ہتھیاروں سے مغربی تہذیب کو کھوکھلا کر دیا۔ انھوں نے اس طنز کو ظرافت کا رنگ دے کر اور زیادہ شگفتہ اور موثر بنا دیا۔ انھوں نے قوم کی زبوں حالت پر آنسو بھی بہائے مگر قہقہہ لگاتے ہوئے۔ بقول رشید صدیقی "وہ طعن و تعجب سے مرافعہ کرتا ہے۔ ہنسا ہنسا کر رلاتا ہے اور کھلا کھلا کر مارتا ہے۔ تلخ حقائق کو شربت کا گھونٹ بنا دیتا ہے۔ روتا ہے تو ایسی صورت

بنا کر کہ لوگ ہنستے ہنستے رو پڑیں اور ہنستا ہے تو اس صورت سے کہ لوگوں کے گریہ گلوگیر ہو جائے۔"

اکبر کا وہ زمانہ تھا جب سماج میں سیاست داخل ہو رہی تھی۔ آقاؤں کے چنگل شدید تر ہوتے جا رہے تھے اکبر ان حالات سے متاثر ہوئے اور ان کا خاکہ اپنے اشعار میں اُڑایا۔ تنوعِ خیالات اکبر کے یہاں متقدمین سے زیادہ ہے اگر اکبر کے کلام کا استقصا کیا جائے تو اس زمانہ کی پنجاہ سالہ سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ اکبر قدیم تہذیب کے دلدادہ و شیدا تھے۔ ان کی دور رس نگاہوں نے مغربی تہذیب کو پہلی ہی نظر میں پرکھ لیا تھا اکبر نے بڑی جرأت سے برطانیہ حکومت کا نوکر ہوتے ہوئے مغربی تہذیب پر بے لاگ تنقید کی۔

اکبر کی طنز نگاری میں ظرافت، پند و نصائح، تہذیب، معاشرت غرض کہ سب ہی کچھ ملتا ہے مغربی تہذیب پر ان کے نشتر بہت گہرے پڑتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

شوقِ لیلائے "سول سروس" نے مجھ مجنوں کو — اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

سینۂ مس کا اُبھارا ے دل فساد انگیز ہے — لوگ سچ کہتے ہیں بادِ انجان بادِ انگیز ہے

واسطہ کم ہو گیا اسلام کے قانون سے — دب گئی آخر مسلمانی مری پتلون سے

غریب اکبر نے بحث پردے کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا — نقاب لٹھ ہی دی اسنے کہہ کر کہ کر ہی لے گا مرا موا کیا

گو بہت اونچی ہے پروازِ حریف — شیخ پھر بھی کم نہیں ہے جمپ میں

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر — خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

اکبر کے اشعار اپنے میں بلا کی نشتریت چھپائے ہوئے ہیں۔ ان کے اشعار سوسائٹی کے عام مذاق اور قوم کی حالت کا نقشہ پیش کرتے ہیں:-

ابھی اس راہ سے انجن گیا ہے — کہے دیتی ہے تاریکی فضا کی

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاء اللہ — مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

شیخ جی مر گئے کمیٹی میں — غل ہوا خاتمہ بخیر ہوا

واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر — پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

اکبر کا ظریفانہ کلام اُردو ظریفانہ شاعری کا عروج ہے انھوں نے مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے دھارے کو حتی المقدور روکا۔ ان کی ظرافت زندہ دلوں کو ہنساتی اور اہل نظر کو رُلاتی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں "فطرت کی جانب سے وہ ایک رسول ہو کر آئے تھے۔ ان کا پیام تحریک مغربیت کے خلاف ردِ عمل تھا ان کی شاعری اول سے آخر تک اسی مادیت اور مغربیت کا جواب ہے"۔ اکبر نے اپنا مفہوم آسانی سے ادا کرنے کے لئے چند خاص الفاظ مقرر کر لئے تھے جن سے وہ بہت بڑے بڑے مطلب نکال لیتے تھے۔ مثلاً بدھو، وفاتی، مولوی، لیڈر

شیخ، ڈنر، گزٹ، صاحب، سید وغیرہ وغیرہ۔ چند مزید اشعار سنئے :-

وہ فقط وضع کے کشتہ ہیں نہیں قید کچھ اور — بھینس کو گون بنا دیجئے عاشق ہو جائیں

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ — رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دے — گھیر ہی لیں گے پولیس والے سزا ہو یا نہ ہو

اکبر کے بعد اُردو کی ظریفانہ شاعری میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ شعرا میں ریاض خیرآبادی۔ مقبول حسین ظریف ستم ظریف۔ آزاد اور سرشار وغیرہ نے گلہائے تازہ کھلائے۔ اودھ پنچ کا اجرا ہوا جس نے بہت سے عمدہ ظرافت نگار پیدا کئے لیکن ان میں افادیت کا پہلو زندگی کے عالمگیر مسئلہ سے دور رہا۔ ریاض کے یہاں محض ظرافت شوخی، شگفتگی اور سادگی ہے۔ ریاض کی رنگین و شوخ طبیعت نے صرف نظم پر اکتفا نہیں کی بلکہ نثر میں بھی خوب جوہر دکھائے ہیں۔ جس کے شاہد "فتنہ" اور "عطر فتنہ" ہیں۔ جب اودھ پنچ اپنے شباب پر تھا اُس وقت یہ مختصر سے پرچے جاری ہوئے۔ فتنہ میں بہت ہی مختصر نثر کے مضامین ظریفانہ رنگ میں ہوتے تھے اور "عطر فتنہ" میں مزاحیہ اشعار کا انتخاب ہوتا تھا اور جو بہت جلد زبان زدِ خاص و عام ہو جاتے تھے۔ ادبی دنیا ریاض کو بحیثیت ایک شاعر کے زیادہ جانتی ہے اس لئے ہم بھی ان کے کچھ اشعار پیش کرتے ہیں جن سے ان کی فطری ظرافت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

مے چرانے میں ہمیں ہے یدِ طولیٰ کیسا — ہم اُڑا لائے سبو آج اچھوتا کیسا

دستِ شفقت اس طرح اک رند نے پھیرا ریاض — بیٹھ کر یادِ خدا میں جھومتا جاتا رہا،

چُن چُن کے آج شیخ نے انگور کھائے — اب کیا رہا ہے تاک کا حاصل نکل گیا

ناصح کے سر پہ ایک لگائی تڑاق سے — پھر ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں

اُتر گئی سرِ بازار شیخ کی پگڑی — گرہ میں دام نہ ہوں گے اُدھار پی ہو گی

منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ کا اجرا کیا۔ اودھ پنچ شوخی اور ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور سے لوگ اس کے فقروں اور لطیفوں پر لوٹتے رہتے تھے۔ جو پھبتی اس میں نکل جاتی وہ مہینوں تک لوگوں کی زبان پر رہتی۔ ظرافت کے اعتبار سے یہ اپنے رنگ کا پہلا پرچہ تھا۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں کا ایک خاص حلقہ تھا جو کسی دوسرے پرچے میں لکھنا کسرِ شان سمجھتا تھا۔

اودھ پنچ نے جس ظرافت کو عروج دیا وہ ہماری ظرافت سے کچھ مختلف تھی۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں کی تحریر میں ایک خاص جوش، رعنائی اور جوانی نمایاں ہے۔ ظرافت کی تہ میں چھپے ہوئے طنز نے ان کی تصانیف کو شگوفہ بنا دیا ہے۔ شدتِ احساس اور پختگی شعور نے ان کے یہاں عمق اور امعانِ نظر پیدا کر دیا ہے۔ (باقی)

ماجد ولین کیا ہے

اور اس کی ادبی اہمیت کیا ہے ؟ —— اس کا اندازہ آپ کو ان خطوط سے ہو سکتا ہے جو اس ناول کے ہیرو نے اپنی محبوبہ "ماجد ولین" کے نام لکھے تھے۔

یہ خطوط اس وقت کے، جب ماجد ولین نے دوسرے شخص سے شادی کرنے کا اقرار کیا تھا اور ہیرو حد درجہ مایوس ہو کر اس سے "پاس عہد" کی التجائیں کر رہا تھا ان خطوط میں سے صرف ایک خط اس اشاعت میں درج کیا جاتا ہے۔

تمنے مجھے دو حرف بھی نہ لکھے، حالانکہ میں نے کس قدر خوشامد کی تھی —— کیا تمہارا ماحول تمہیں اس زمانہ کی یاد نہیں دلاتا جو کسی وقت میں نے تمہارے ساتھ گزارا تھا۔

تمہارے سامنے اب بھی وہی سورج ہے جسے ہم دونوں روز صبح کو نکلتے اور شام کو چھپ جاتے ہوئے دیکھتے تھے اور وہیں وہ چاند بھی ہے جو آسمان کی بلندیوں سے ہمیں جھانکا کرتا تھا اور ہم دونوں کو اپنی سفید چاندنی کی چادر میں چھپا لیا کرتا تھا اور وہیں وہ جگہ بھی ہے جہاں پانی اور سایہ کے درمیان ہم تم بیٹھا کرتے تھے تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں اور میرا ہاتھ تمہارے سینہ پر —— اور وہیں وہ چھوٹا سا سمندر بھی ہے جس کے کنارے ہم دونوں روز شام کے وقت ٹہلا کرتے تھے اور اگرچہ ہماری زبانیں خاموش رہتی تھیں، لیکن ہماری آنکھیں ہمارے دلوں کی ترجمانی کیا کرتی تھیں اور پھر لوٹتے وقت ہم یہ تمنا لئے واپس ہوتے تھے کہ کاش زمانہ ہمیں اپنے بہاؤ میں کسی ایسی بستی تک پہونچا دے، جہاں سے ہم پھر کبھی جدا نہ ہو سکیں۔ اور وہیں وہ کرا بھی ہے جس میں جدائی کی رات ہم ایک دوسرے سے ملے تھے اور ہم نے رو رو کر اپنے آنسوؤں سے اسکی زمین کو تر کر دیا تھا اور جس کی چھت کے نیچے ہم نے عہد کیا تھا کہ جب تک زندہ ہیں ایک دوسرے سے بد عہدی نہ کرینگے —— اے ماجد ولین، میں تمہیں دن میں سیکڑوں مرتبہ رو رو کر چیخ چیخ کر پکارتا ہوں، لیکن میری آواز تمہارے کانوں تک نہیں پہونچتی اور تمہیں میرے حال پر ذرا رحم نہیں آتا۔

اگر تم اپنی زندگی میں کسی ایسی عورت کو دیکھو جو اپنے شوہر کی قبر پر دو زانو بیٹھی ہوئی ماتم کر رہی ہو اور انتہائی حسرت و یاس سے رو رہی ہو کیونکہ وہ اس سے بہت محبت کرتی تھی اور وہ اس سے عین عالم شباب میں چند چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر جدا ہو گیا تھا۔ اور اسے روتا دیکھ کر تم بھی رونے لگو ——— یا تمھیں راستہ میں کوئی غریب لڑکی نظر پڑے جو ماری ماری پھر رہی ہو، روتی جاتی ہو اور ہر آنے جانے والے سے اپنے چھوٹے بیمار بھائی کی دوا کے لئے جس کا اس دنیا میں کوئی سہارا نہیں ہے بھیک کے چند پیسے مانگنے کے لئے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ پھیلا رہی ہو اور تم رحم کھا کر اس کی خواہش کو پورا کر دو ——— یا کبھی کسی دریا پر تمھارا گزر ہو اور تم اس کے کنارے ایک عورت کو چیختے ہوئے دیکھو جو رو رو کر لوگوں کو اپنے اس اکلوتے بچے کی مدد کے لئے بلا رہی ہو جو اس کی آنکھوں کے سامنے دریا میں ڈوبا جا رہا ہے، لیکن بچانے والا کوئی نہ ہو یہاں تک کہ وہ ڈوب جائے اور ڈوب کر پھر نہ ابھرے اور یہ دیکھ کر کہ وہ خود بھی دیوانہ وار دریا میں کود پڑے۔ اور تم اس کی مصیبت پر رو دو۔ ——— یا تم اس غریب بوڑھے کا قصہ سنو جو اپنی قریب الموت بیوی اور بیمار لڑکی کے سرہانے دو زانو بیٹھا ہوا ہو اور پولیس کے سپاہی اسے گرفتار کرنے کے لئے اس کے گھر میں گھس آئے ہوں، کیونکہ اس نے گزشتہ رات ان دونوں کی جانکنی کی تکلیف سے مجبور ہو کر ان کے لئے ایک روٹی چرائی تھی اور ہر چند ان سپاہیوں سے التجا کرے کہ اسے ایک گھنٹہ کی مہلت دیدیں تاکہ اسے اپنی بیمار بیوی کے متعلق خدا کے آخری فیصلہ کا علم ہو سکے، لیکن وہ سخت دل انکار کر دیں ——— یا تم اس شخص کے واقعہ کو سنو جو کسی بے آب و گیاہ صحرا میں راستہ بھول گیا ہو، پیاس کی شدت بڑھ رہی ہو اور وہ ہر طرف پانی کی تلاش میں حیران و سرگرداں پھر رہا ہو لیکن پانی کہیں نہ ملے یہاں تک کہ وہ تھک کر گر پڑے اور چلنے سے رہ جائے۔ پھر اسے کہیں دور سے پانی کی چمکتی ہوئی سفید چادر دکھائی دے اور وہ بیتاب ہو کر گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہوا اور اپنے جسم کے خون سے میدان کی کنکریوں کو رنگتا ہوا اس کی طرف بڑھے اور جونہی اس کے قریب پہونچے، پیاس کی شدت سے جان دیدے ——— یا تم اس عورت کے قصہ کو پڑھو جسے لوگوں نے قحط کے زمانہ میں اپنی جھونپڑی کے آگے بیٹھے ہوئے دیکھا ہو، اس کی گود میں گوشت کا ایک سرخ ٹکڑا ہو اور اس کے سامنے چولھے پر چڑھی ہوئی ہانڈی سے دھواں نکل رہا ہو، لیکن جب وہ اس کے قریب پہونچیں تو یہ دیکھ کر ڈر جائیں کہ اس کے ہاتھ میں خون آلودہ چھری بھی ہے اور دو چھوٹے چھوٹے پاؤں ہانڈی سے باہر نکلے ہوئے ہیں، اس وقت انھیں معلوم ہو کہ خاتون نے اسے پاگل بنا دیا ہے اور گوشت کا سرخ ٹکڑا جو اس کی گود میں ہے اس کے بچہ کا گوشت ہے جسے اس نے ذبح کر کے چھری سے اس کا جوڑ جوڑ الگ کر دیا ہے اور اب وہ اسے کھانے کے لئے پکا رہی ہے ——— اگر

تم نے ایسے مصیبت زدوں کے حالات کبھی سنے ہوں، اگر قید خانوں میں بیگناہوں کی آہ وزاری نے تمہارے کانوں کے پردوں کو ٹکرایا ہو۔ یا اسپتالوں میں بیماروں کی کراہ نے تمہارے دل کو کبھی دہلایا ہو، تو ——— اے ماجدولین، یقین کر کہ میں ان سب سے زیادہ بدنصیب مظلوم اور قابلِ رحم ہوں۔

اب میرے صبر و تحمل کا پیمانہ بھر چکا ہے اور اب اس سے زیادہ ضبط کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے بعد میں تمہیں کوئی خط بھی نہ لکھ سکوں، کیونکہ ناتوانی انتہا کو پہونچ چکی ہے، اور آنکھوں سے تیرگی کے باعث دیکھنا بھی دشوار ہے۔ اس لئے ۔ اے ماجدولین رخصت، زندگی بھر کے لئے رخصت اگر زندگی ابھی کچھ اور باقی ہے اور اگر نہیں تو ابھی سے ہمیشہ کے لئے رخصت!

(نوٹ) اس فسانہ کا ایک ٹکڑا اور، آئندہ اشاعت میں پیش کیا جائے گا۔

دی مغل لائن لمیٹیڈ

حج

عازمینِ حج کے لئے ہدایات

عازمینِ حج کی توجہ حکومتِ ہند کے اُن مختلف اعلانات کی طرف مبذول کی جاتی ہے جو ۱۵ مئی یا اسکے بعد انگریزی اور اُردو کے بڑے بڑے اخباروں میں شایع ہو چکے ہیں۔

جہاز کا کرایہ (مع خوراک)

بمبئی سے جدّہ واپسی	کراچی سے جدّہ واپسی
فرسٹ کلاس -/-/۹۷۵	فرسٹ کلاس -/-/۹۵۰
عرشہ جہاز -/-/۲۸۵	عرشہ جہاز -/-/۲۷۵

ان کرایوں میں کامران کا قسطنطینہ، جدّہ کے طبّی اخراجات اور کشتی کا کرایہ شامل نہیں ہے جو مجموعی طور پر ۶۹ روپے ۱۰ آنے ۹ پائی ہے۔
بمبئی اور کراچی سے ۷ ستمبر اور ۱۸ اکتوبر کے درمیان جہاز روانہ ہوں گے۔ صحیح تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

عازمین حج تفصیلات ذیل کے پتہ سے طلب کریں:- حج بکنگ آفیسز کونسل حمیر۔ گورنمنٹ آف انڈیا۔ نئی دہلی
ٹرنر مارڈین اینڈ کمپنی لمیٹیڈ۔ ۱۶ بنک اسٹریٹ۔ بمبئی

باب المراسلہ والمناظرہ

(فراق گورکھپوری کا جواب)

حضرت نیاز

مئی ۱۹۴۶ء کا نگار مجھے ابتک نہیں ملا تھا۔ آج آپ کا بھیجا ہوا تراشہ ملا۔ جناب اس۔ ام۔ اصطفیٰ نے میرے ان اشعار

یہ بھیگی مسیں روپ کی جگمگاہٹ — یہ مہکی ہوئی رسمسی مسکراہٹ
تجھے بھیجتے وقت نازک بدن پر — وہ کچھ جامۂ نرم کی سرسراہٹ
پسِ خواب پہلوئے عاشق سے اُٹھنا — دُھلے سادہ جوڑے کی وہ ملگجاہٹ

پر یہ اعتراض کئے ہیں کہ فراق شاعری میں معصومی نرمی و پاکیزگی کو اپنا مسلک مانتے ہوئے اور چلاتے ہوئے جذبات کے اظہار کے خلاف آواز اُٹھاتے ہوئے مندرجۂ بالا قسم کے اشعار لکھ کر کیا اپنی تردید آپ کر رہے ہیں اور کیا یہ اشعار گندے اور مخربِ اخلاق نہیں ہیں ؟

جواب میں مجھے یہ کہنا ہے بلکہ یہ دعویٰ کرنا ہے کہ جن لوگوں نے گزشتہ کئی برسوں سے میری غزلیں یا میری نظمیں یا میرے دو چار سو اشعار بھی دیکھے ہیں ان پر یہ بے اختیارانہ اثر پڑا ہوگا کہ معصومی نرمی و پاکیزگی کے جو عناصر میرے یہاں نظر آتے ہیں وہ اچھی اور کامیاب اُردو شاعری میں بھی قریب قریب مفقود ہیں اور اگر کہیں ہیں تو اُردو شاعری کے اس بہت تھوڑے سے حصّے میں ہیں جسے ہم پاکیزہ ترین شاعری کہہ سکتے ہیں ——— میری شاعری کے اس مجموعی اثر سے کوئی ایسا شخص انکار نہیں کر سکے گا جس نے

معمولی طور پر بھی میرا کلام دیکھا ہوگا

تو یاد آئے مگر جور و ستم تیرے نہ یاد آئیں — تصور میں یہ معصومی بڑی مشکل سے آتی ہے
ترے خیال میں تیری جفا شریک نہیں، — بہت بھلا کے تجھے کر سکا ہوں یاد تجھے

شاعری کی بحث میں اور اُردو تنقید میں معصومی کا لفظ غالباً میں نے سب سے پہلے استعمال کر کے اسے رائج کیا۔

اب رہی بات مندرجۂ بالا اشعار کی۔ تو ان کے بارے میں پہلے یہ کہہ دوں کہ میں انھیں اپنے معصوم ترین اشعار تو نہیں سمجھتا لیکن اخلاقی طور پر گرے ہوئے اشعار میں انھیں نہیں مانتا۔ جنسیت، شہوانیت اور امرد پرستانہ جذبات و محرکات کے اظہار میں ایک نرم اور مترنم وضاحت، لمسیاتی احساسات کا واضح، نازک، متوازن اور لطیف اظہار، لذتیت کے عناصر کو اشعار میں سمو دینا، مباشرت و انزال تک کی لذتوں کا نازک و پرخلوص اظہار اخلاقیات و جمالیات کے خلاف ہرگز نہیں۔ ان کیفیات و جذبات میں والہانہ بلکہ پرستارانہ عناصر ہوتے ہیں شہوانیت کا خلوص شہوانیت کی معصومی و پاکیزگی کا تنہا ضامن ہے۔ گندگی اور خرابیِ اخلاق کے مرتکب وہ لوگ ہیں جو مجرد بھی نہیں رہتے اور شہوانیت کو پاک اور معصوم چیز بھی نہیں سمجھتے۔ ان حضرات کے دلوں میں چور ہوتا ہے۔ یہ لوگ خباثت نفس اور جذباتی غلاظت و کثافت کے شکار ہوتے ہیں ان مردانِ خدا سے کوئی پوچھے کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ کیا مباشرت چاہی جائے اور کی جائے لیکن اس کی لذتوں سے وجد میں آنے کو مباشرت کی لذتوں کو نغمۂ سرمدی بنا دینے کو گناہ گندگی اور رذالت سمجھا جائے۔ بندہ نواز شہوانی جذبات قبیح نہیں ہوتے نہ شہوانی حرکات شنیع ہوتے ہیں ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ ہر اولاد اپنے والدین کے "قبیح سے قبیح جذبات اور شنیع سے شنیع حرکات" کا پھل ہے۔ حضرت مباشرت اور بوس و کنار کے پاک عمل اور معصوم شہوانی جذبات کے تصور سے فوراً سجدے میں گر جایئے کہ انھیں سے آپ کی ہستی عبارت ہے۔ آپ کے دل کا یہ چور ہے کہ شہوت اور مباشرت سے دنیا بنی ہے اور قایم ہے، شہوت و مباشرت ناگزیر شرط حیات ہیں لیکن ہیں گندی چیزیں۔ یہ چیزیں گندی نہیں ہیں۔ گندے ہیں آپ۔ ایسا آدمی اگر بدقسمتی سے شاعر ہو جاتا ہے تو اپنے عشقیہ اشعار میں جذباتِ عشق کو، معشوق کو، شہوانیت و جنسیت کو منہ چڑھاتا ہے، فحش اشعار کہنے لگتا ہے اور فحش شعر کہنے سے بھی ایک زیادہ گندی حرکت کرتا ہے یعنی چھچھورے اشعار کہنے لگتا ہے۔

فحاشی عریانی کا نام نہیں ہے۔ عریانی کو اجنتا کے صناعوں نے یونان اور روما کے بت گروں نے مشہور عالم شعرا اور فن کاروں نے بہت لطیف نازک پاکیزہ جمالیاتی چیز بنا کے دکھا دیا ہے۔ عریانی فحاشی نہیں ہے ہمارا جسم فحش چیز نہیں ہے۔ فحاشی نتیجہ ہے دو دِلے پن کا، یعنی اس حالت کا جب ہم اپنے اندر جنسی محرکات بھی پائیں اور اس غیبی تحریک پر اپنی ملامت بھی کریں جب ہم جنسیت سے ہم آہنگ نہ ہو سکیں جب ہم جنسیت کو ایک لعنت سمجھیں۔ اسی داخلی تصادم کی پیداوار فحاشی ہے۔ اور اگر ایسی حالت میں کھلی کھلی فحاشی بھی نہ ہو سکی تو چھچھورے اور کثیف لہجے میں ہوس ناک اشعار لوگ کہنے لگتے ہیں۔ فحاشی نام ہے جنسی جذبات و محرکات میں عدم خلوص کا۔

میں اب کچھ اپنے ہی اشعار پیش کر کے چند نتائج کی طرف اشارہ کروں گا:۔

یہ وصل کا ہے کرشمہ کہ حسن جاگ اُٹھا　　ترے بدن کی کوئی اب خود آگہی دیکھے

پر خلوص مباشرت کے بعد جو طمانیت معشوق کے چہرے پر جھلک اُٹھی ہے اور اس کے جسم میں جو خود آگہی آگئی ہے لذت مباشرت کے اسی اثر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن کتنا لطیف نازک اور سنگھار اس میں ڈوبا ہوا

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ لے دوست　　ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

اس شعر میں بھی لذتِ مباشرت کے ایک بہت نازک اور لطیف اثر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اب ان اشعار سے بھی عریاں اشعار لیجیے جو میری اس رباعی میں ملیں گے:۔

نکھری سحر اپنی لہلہاہٹ بھولے　　بیخود روحِ نمو کہ سینہ چھولے
ہنگام وصال وہ سرکتا ملبوس　　زرّیں کمر اور جگمگاتے کولے

کتنی عریاں رباعی ہے اور کتنی نازک اور لطیف! کثافت کی پرچھائیں بھی اس رباعی پر نہیں پڑتی۔ لیکن جو اس رباعی سے ڈر جائے اور اسے کثیف یا فحش بتائے اس کی جنسی زندگی وحشی اور جنگلی رہی ہے۔ ایسا آدمی اپنے آپ سے ڈرا ہوا ہے

پہلو کی وہ کہکشاں وہ سینے کا اُبھار　　ہر عضو کی نرم لو میں مدھم جھنکار
ہنگام وصال پینگ لیتا ہوا جسم　　سانسوں کی شمیم اور چہرہ گلنار

یہ مصرعے بھی ملاحظہ ہوں:۔

تا کمر جسم کچھ رہیں ڈھیلے　　اور پیڑو سے یوں بھنچے پیڑو،
سر کو سر سے لگا کے دو ارنے　　جس طرح زور آزماتے ہوں،
پھر وہ جسموں کا مل کے لہرانا　　کرشن کا رقص ناگ کے پھن پر

دیکھا آپ نے آخری مصرعے کی جادوگری۔ کثافت، کس طرح لطافت کی جان بن گئی! جو شخص اعضا بنا دینے والی مباشرت کے عالم میں بھی حسن کے اتنے پہلوؤں کا رنگین اور لطیف احساس حاصل کر سکے اس کی شخصیت بہت بلند ہوگی۔ لیکن میرا عشقیہ کلام تمام تر لمسیاتی نہیں ہے پھر بھی لمسیات کو جس طرح رنگین اور لطیف اور بھرپور میں نے بنا دیا ہے میں اُسے پست اور گندی چیز ماننے کو طیار نہیں ہوں۔ جس کی شہوانیت معصوم و پُر خلوص ہوگی وہ میرے ایسے اشعار میں صرف طہارت پائے گا۔ طہارت نام ہے زندگی میں ڈوب جانے کا زندگی میں اور زندگی کی لذتوں میں جن میں جنسی اور شہوانی لذتوں کا بہت بڑا مقام ہے۔ بقول ڈاکٹر جانسن:۔

There is no dearth of scoundrels,
but men of pleasure of Less.

ہاں تو شہوت بری چیز نہیں ہے شہوت جب چھچلی ہوتی یا جب شہوانی جذبات میں شعوری گہرائی نہیں ہوتی اسوقت گندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ شہوت میں شدت اور نرمی کا اتصال اُسے عشق میں تبدیل کر دیتا ہے۔

جناب اس۔ ام۔ اصطفےٰ پوچھتے ہیں "کیا ایسے اشعار کا منظرِ عام پر لانا یا یوں کہئے کہ اس جذبہ کا پرچار قوم کے نونہالوں میں کرنا قوم، ملک، سوسائٹی کے لئے مفید ہے؟"

جواب میں عرض ہے کہ بلند ادب کا ایک حصہ اور صرف ایک حصہ رچائی ہوئی اور سنواری ہوئی شہوانیت کے جذبات، تجربات، احساسات وکیفیات کے جمالیاتی اظہار کا ہوا کرتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ مقدار میں بلند ادب کا وہ حصہ ہوتا ہے جس کا تعلق انفرادی اور سماجی کے دوسرے اہم مسایل سے ہوتا ہے۔ اور قوم ملک سوسائٹی کا فرض ہے کہ بلند ادب ہر طرح کے کارناموں سے متاثر وہم آہنگ ہو۔ لیکن اگر ہمارے ملک وقوم کے نونہالوں میں صحت بخش محرکات سماجی زندگی کی فضا پیدا کر سکی ہو تو جیسے جنسی اشعار میں نے کہے ہیں ان کا اثر ان کی جنسی تربیت وتعلیم ہوگی لمسیاتی اشعار کچی جنسی بھوک کے نونہالوں کے لئے اتنے خطرناک نہیں ہوتے جتنے پتلی رقت والے "مہذب" عشقیہ اشعار ہوا کرتے ہیں۔ میں نے اپنی جو رباعیاں یا جو اشعار پیش کئے ہیں یا میرے جو اشعار جناب اصطفےٰ صاحب نے پیش کئے ہیں وہ کمینے جنسی جذبات کسی نوجوان میں پیدا نہیں کریں گے۔ انسانی حسن دنیا اور زندگی کے اُن معمّوں میں سے ہے اور ہمارے لئے اتنا بڑا چیلنج ہے کہ اگر ہم نے اس سے آنکھ پھیری تو بچنے کے بجائے مٹنے کا احتمال ہے۔ ضرورت ہے کہ جنسیت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیجائیں۔

یہ سطور میں نے اس لئے نہیں لکھیں کہ جو لوگ کمزور اور پھوہڑ فحاشی یا گھٹیا اور ناکامیاب عریانی کا پروپیگنڈا کرتے ہیں وہ میرے بیانات کا حوالہ دیکر اپنی سڑی گلی شاعری کا جواز پیش کریں۔ جیسی جنسی شاعری میں نے کی ہے ایسی شاعری کرنے کا حق اسی کو ہے جس کا جسم اور جس کے دل ودماغ پچاس برس تک جنسی تاثرات کو ہضم کرتے رہے ہوں۔ ایسی شاعری کے لئے چاہئے کہ جوانی ہو اور عمر۔

فراق گورکھپوری

(نگار) میں جناب فراق کی اس تحریر پر (جسے جواب، معذرت، تاویل یا برہمی جو چاہے سمجھئے) آئندہ اشاعت میں اظہار خیال کروں گا۔ نیاز

ضروری اطلاع (۱) اپنا نمبر خریداری جو ہر مہینے پتہ کی چٹ پر بائیں طرف درج ہوتا ہے اسے نوٹ کر لیجئے اور خط وکتابت میں اس کا حوالہ ضرور دیجئے۔ (۲) جواب کے لئے ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجئے ورنہ جواب کی توقع نہ رکھئے۔

مالہ وماعلیہ

ماہر القادری

جولائی کے شاعر میں جناب ماہر القادری کی ایک غزل شایع ہوئی ہے :-

حُسنِ شوخی بن گئے، جانِ نزاکت ہو گئے
تم جواں ہو کر قیامت ہی قیامت ہو گئے

عیش کی راتیں پلک جھپکی نہ تھی کہ کٹ گئیں،
اور غم کے چند لمحے بھی مصیبت ہو گئے

اب مرے افسانۂ غم پر ہنسی آتی نہیں
بندہ پرور! آپ اتنے بے مروت ہو گئے

اس جہاں میں ہر کوئی کرتا ہے منہ دیکھے کا پیار
شمع کے بجھتے ہی پروانے بھی رخصت ہو گئے

ساز دل چھڑتے ہی اک طوفان برپا ہو گیا
لب تک آتے آتے سب نغمے شکایت ہو گئے

زندگی کا ماحصل غم کے سوا کچھ بھی نہ تھا
جتنے پہلو غم کے تھے صرفِ محبت ہو گئے

جورِ بے پایاں کا شکوہ اُن سے ماہر کیا کروں
اُن کے اب مجھ پر کرم بھی بے نہایت ہو گئے

مطلع :- "حُسنِ شوخی" کی ترکیب تکلف سے خالی نہیں اور "جانِ نزاکت" کے مقابلہ میں بہت کمزور ہے "جانِ نزاکت" تو بالکل ٹھیک ہے کیونکہ اس سے نزاکت کا انتہائی معیار ظاہر ہوتا ہے اور اسی قسم کا اظہارِ خیال شوخی کے متعلق بھی ہونا چاہئے تھا، لیکن مصرعہ پورا کرنے کے لئے انھیں لفظ حُسن کا اضافہ کرنا پڑا، اس سے اچھا تو یہ ہوتا کہ وہ یہاں بھی جان کا لفظ استعمال کرتے۔

دوسرے مصرعہ میں "قیامت ہی قیامت ہو گئے" خلافِ محاورہ ہے، صرف "قیامت ہو گئے" ہونا چاہئے تھا۔ یہ مصرعہ اگر یوں ہوتا :-

اور بھی تم تو جواں ہو کر قیامت ہو گئے

تو زور بھی پیدا ہو جاتا اور یہ عیب بھی باقی نہ رہتا۔

۲- پہلے مصرعہ میں کہ (کاف بیانیہ) کے ہوگیا ہے، جو بالکل غلط ہے۔ ہوسکتا ہے کہ غلطی کتابت کی ہو اور مصرعہ کے الفاظ کچھ اور ہوں۔

۳- اس شعر میں معنوی نقص ہے وہ یہ کہ محبوب کی بے مروتی کے ثبوت میں یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ اب اسے افسانۂ غم پر ہنسی نہیں آتی۔ حالانکہ ہنسی کا نہ آنا تو تاثر کو ظاہر کرتا ہے اور یہ بے مروتی نہیں۔ اگر یہ کہا جاتا کہ "اب مرا افسانۂ غم آپ سنتے بھی نہیں" تو بیشک بے مروتی ثابت ہوسکتی تھی۔ لیکن اگر پہلا مصرعہ اس مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے کہ:- "اب مرے افسانۂ غم پر آپ ہنستے بھی نہیں" تو پھر بے مروت کی جگہ بے تعلق ہونا چاہیئے۔

۶- اس شعر کا مفہوم اُلجھا ہوا ہے۔ اور دونوں مصرعوں میں ربط پیدا کرنے کے لئے تاویل کی ضرورت ہے پہلے مصرعہ میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ زندگی میں سوائے غم کے کچھ نہیں اور دوسرے مصرعہ میں یہ کہکر کہ غم محبت کے کام آگیا، غم کی اہمیت کو کم کردیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے پہلے مصرعہ کا انداز بیان تشائم یا حزنیہ (pessimistic) ہے جس سے شکایت کا پہلو پیدا ہوتا ہے لیکن دوسرے مصرعہ سے بالکل متضاد مفہوم پیدا ہوتا ہے کیونکہ وہ غم جو محبت کے کام آئے قابل قدر چیز ہے اور اسے باعث حزن و ملال یا وجہ شکایت نہ ہونا چاہیئے اگر یہ تاویل کی جائے کہ "زندگی اور محبت ایک ہی چیز ہے اور چونکہ محبت کی پرورش غم ہی سے ہوتی ہے اس لئے زندگی غم کے سوا کچھ نہیں"۔ تو اس صورت میں ماحصل کا استعمال صحیح نہیں، اسکی جگہ مدعا کہنا چاہیئے تھا

حضرت سیماب

شاعر کی اسی اشاعت میں ششماہی مشاعرہ کے سلسلہ میں بعض شعراء کی غزلیں شایع کی گئی ہیں، جن میں سب سے پہلی غزل حضرت سیماب کی ہے۔ اس کا ایک شعر ہے:-

ہے عجیب فطرت آدمی، نہیں چین اس کو کسی طرح — کبھی مدعا سے گریز پا کبھی مدعا کی تلاش ہے

دوسرے مصرعہ میں گریز پا کا استعمال محل نظر ہے۔ جناب سیماب نے اسے گریزاں کی جگہ استعمال کیا ہے، حالانکہ گریز پا اور گریزاں دونوں کے محل استعمال میں تھوڑا سا فرق ہے، گریز پا، عام طور پر ناپایدار کے مفہوم میں مستعمل ہوتا ہے جیسے جلوۂ گریز پا، صبر گریز پا اور گریزاں مفہوم احتراز کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے اگر یہ مصرعہ یوں ہوتا:

کبھی مدعا سے گریز ہے، کبھی مدعا کی تلاش ہے

تو روانی و سلاست بھی پیدا ہو جاتی اور یہ عیب بھی باقی نہ رہتا۔

اس غزل کا چوتھا شعر ہے :۔

وہ جمال جلوۂ منتظر، ہے خود آشنائی میں مستتر کسی خود نگر کی تلاش کر جو خدا نما کی تلاش ہے

جمالِ جلوۂ منتظر یا جلوۂ جمالِ منتظر؟۔ جلوہ میں بھی جمال ہے، لیکن جلوہ کے لئے پہلے جمال کا پایا جانا ضروری ہے، اس لئے جلوۂ جمال میں بہ نسبت جمالِ جلوہ کے زیادہ معنویت ہے، علی الخصوص ایسی حالت میں جبکہ کسی "خود نگر" کی تلاش کا سوال سامنے ہو کہ اس کا تعلق یکسر جلوہ ہی سے ہے۔

چھٹا شعر ہے :۔

نہیں بے نیاز کی شان یہ کہ دعا کروں تو جزا ملے جو بغیر عرض نواز دے، مجھے اس خدا کی تلاش ہے

پہلے مصرعہ میں جزا ملے، جزا دے کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں نواز دے لکھ گیا ہے، حالانکہ محاورہ کے لحاظ سے نواز ے ہونا چاہئے۔

دسواں شعر ہے :۔

یہ خودی کے نشہ میں باؤلے، وہ اجارہ دار خدائی کے ہیں یہاں خدا ہی خدا پڑے۔ تجھے کس خدا کی تلاش ہے

دوسرے مصرعہ کا پہلا ٹکڑا کانوں کو اچھا نہیں معلوم ہوتا — اس غزل کا یہ شعر بہت پاکیزہ ہے :۔

یہ غبارِ عظمتِ رفتگاں، ابھی کیوں بنا انہیں کارواں یہ ہے کیوں جہاں میں رواں دواں، اسے کس ہوا کی تلاش ہے

اسی زمین میں جناب وحشت کلکتوی کی بھی غزل شایع ہوئی ہے، غزل کا تیسرا شعر ہے :۔

ملے درد میں نہ مزا اگر تو قصور ہے ترے دل کا یہ وہ مریض ہی نہیں عشق کا کہ جسے دوا کی تلاش ہے

دوسرے مصرعہ میں کہ اگر نہ ہوتا تو بہتر تھا۔

مقطع خوب ہے :۔

نہیں وحشت اب ہوسِ چمن کہ گئی امید شگفتگی میں جہاں کسی کو نہ پا سکوں مجھے اس فضا کی تلاش ہے

اسی زمین میں جناب دل شاہجہانپوری کی بھی غزل ہے، جو بہت صاف و بے عیب ہے لیکن ایک جگہ انھوں نے چشم جور نواز کی ترکیب استعمال کی ہے، جو ہر چند غلط نہیں، مگر یہاں اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ مصرعہ یہ ہے :۔

تری چشم جور نواز میں مجھے اب وفا کی تلاش ہے

اس غزل میں جناب دل کا یہ شعر خصوصیت سے قابل داد ہے :۔

اسی سلسلہ میں گزر گئے کئی دور منزل عشق کے کبھی رہنما کی خبر نہیں، کبھی رہنما کی تلاش ہے

برکھارت

جھومتی، گرتی، سنبھلتی بدلیوں کے ساز پر
پھر گل و سرو و سمن کی بھیگی بھیگی چھاؤں میں
ایک طوفانِ طرب، اِک سیلِ ابر و باد میں،
جن فسانوں سے ہزاروں محفلیں برہم ہوئیں
جس کی ناز آرائیاں رسوائے دوراں کر گئیں
بزم میں نظموں کی پھر فرمائشیں ہونے لگیں
پھر مناجاتوں کے آنسو آنکھ میں آنے لگے
دور تک جا جا کے پھر آنے لگی واپس نگاہ
جیسے کوئی راستے میں دور سے آواز دے
جس گلی سے بارہا لوٹ آئے تھے کچھ سوچ کر
تھا جنوں کو جس کے کوچے میں نہ جانے کا غرور
سب سے پھر نظریں بچا کر راستوں میں بھیگتے
او غزالِ دامِ افگن پھر کوئی نیچی نگاہ

مہوشوں کے گیت پھر گانے کا موسم آ گیا
زمزموں کی آگ دہکانے کا موسم آ گیا
ساغر و مینا کے ٹکرانے کا موسم آ گیا،
پھر وہی افسانے دہرانے کا موسم آ گیا
پھر اُسی کے ناز فرمانے کا موسم آ گیا
آپ اپنے تیر پھر کھانے کا موسم آ گیا
پھر دعا کو ہاتھ پھیلانے کا موسم آ گیا
پاؤں کی آہٹ پہ گھبرانے کا موسم آ گیا
چلتے چلتے یوں ٹھہر جانے کا موسم آ گیا
اُس گلی میں ٹھوکریں کھانے کا موسم آ گیا
پھر اُسی کافر کو سمجھانے کا موسم آ گیا
اُس دیارِ ناز میں جانے کا موسم آ گیا
تیری آنکھوں کی قسم کھانے کا موسم آ گیا

اب تو ہنسنا ہی پڑے گا اُس کو ہنستا دیکھ کر
اپنے ہر آنسو کو جھٹلانے کا موسم آ گیا

(پروفیسر) شورؔ

غزل : عرشیؔ بھوپالی

اُن کو دیکھا تھا ابھی پھر اس طرح بیتاب ہوں
طعنۂ احباب، دنیا کی قیاس آرائیاں
عصمتِ کونین اُس برباد اُلفت پر نثار
اُن کی محفل میں بھی عرشیؔ کم نہیں دل کی تڑپ

واقعی دیکھے ہوئے جیسے زمانا ہو گیا
اک تری خاطر مجھے سب کچھ گوارا ہو گیا
اُن کے دامن کو بچا کر خود جو رسوا ہو گیا
طبیعت کو خدا جانے مری کیا ہو گیا

زمین کی باتیں

کچھ آسماں کی نہیں مجھ سے سُن زمین کی بات
کہ ماہ و مہر سے بہتر چمک رہی ہے حیات
یہ چاندنی رخِ روشن کی اور یہ زلف کی رات
گناہ کر کے تجھے مل سکے گنہ سے نجات
نجات کا ہے تصور اگرچہ بے خبری

جنوں کی نیند وہ خوابیدہ کروٹوں کی لچک
وہ تازگی وہ غنودہ سی بجلیوں کی لپک
وہ دستِ شوق کی آہٹ سے بیخودی میں جھجک
بھرا ہوا کوئی پیمانہ جیسے جائے چھلک
یہ مے اگرچہ ہے نوغنچگی میں پردہ دری

بہت حسین ہے دنیا غمِ جناں سے گزر
زمیں بنا کے تمنائے آسماں سے گزر
وصال و ہجر کی پارینہ داستاں سے گزر
حریمِ ناز میں آ عشقِ ناتواں سے گزر
تری شکست ہے ایجادِ نالۂ سحری

تڑپ رہی تھی تجلی نگاہ کر نہ سکا
ہمہ گناہ تھا تو ادرگناہ کر نہ سکا
تمام روئے زمانہ سیاہ کر نہ سکا
وہ کیا کرے گا جو خود کو تباہ کر نہ سکا
وجود، خاک کی مٹھی، حیات جاں سپری

جو تو اَمِٹ ہے تو دنیا کو بے ثبات نہ کہہ
مقلدی کو حقیقت کی کائنات نہ کہہ
نہ تازگی ہو تو افسانۂ حیات نہ کہہ
دل و دماغ سے پوچھے بغیر بات نہ کہہ
کہ ہے کتاب کی دنیا فریبِ خوش نظری

سبق ملا ہے جو دنیا کی زندگی سے مجھے
فریب کر کے رہا ہے خود آگہی سے مجھے
نہیں ہے صورتِ انکار رہروی سے مجھے
مگر یہ ڈر ہے ترے دل کی سادگی سے مجھے
کہ راہزن نہ پہن لے لباس راہبری

نشورؔ واحدی

وقفے

بھٹک رہی ہیں ہوائیں، سسک رہے ہیں چراغ
کہیں شراب کے دھبے، کہیں شکستہ ایاغ

لہو کے داغ ہیں بکھرے ہوئے گلاب کے پھول
مہین دھول میں قالین ہو رہے ہیں ملول

نہ زمزمے ہیں، نہ میخوار ہیں، نہ ساقی ہیں
لرزتی کانپتی پرچھائیاں سی باقی ہیں

یہاں وہاں سے اُداسی سمٹتی آتی ہے
وہ خامشی ہے کہ ظلمت بھی سرسراتی ہے

ہوا کی چھیڑ سے جب پردہ پھڑپھڑاتا ہے
فضا میں بھوت سا اک، تالیاں بجاتا ہے

معًا چمک کی پھواریں گریں ستاروں سے
فضا چھلکنے لگی ان شہاب پاروں سے

ہوا میں رقص کا احساس کنمنانے لگا
وہ سُر چھڑے کہ زمانے کو وجد آنے لگا

بڑھا وہ ساقیِ مہوش، وہ مے نواز اُٹھے
سنبھالتے ہوئے نَے کو وہ نَے نواز اُٹھے

چراغ ہنسنے لگے، پھول مسکرانے لگے
سبو چھلکنے لگے، ساز گنگنانے لگے

سحر طلوع ہوئی، آسمان ڈھل سا گیا
جہاں پہ وقفۂ ظلمت کا راز کھل سا گیا

احمد ندیم قاسمی

غزل : قمر ہاشمی ٹونکی

شکوۂ غم کیا کریں اُس فتنہ گر کے سامنے
اور بھی ہیں منزلیں اہل نظر کے سامنے

دل ہزاروں مٹ گئے اُس کی نظر کے سامنے
آئینے ٹوٹا کئے آئینہ گر کے سامنے

قصۂ برق و نشیمن کیا سناؤں ہمنشیں،
گھر مرا جلتا رہا میری نظر کے سامنے

کیا کسی کے آستاں سے اُسکے سجدوں کو غرض
وہ جبیں جو جھک چکی ہے تیرے در کے سامنے

آسماں تک سے ہزاروں بار کھیلا ہوں مگر
عقل ہو جاتی ہے گم اُسکی نظر کے سامنے

برسات

بادل کا آنچل لہراتی، بجلی کے کنگن چمکاتی
دامن کی نمناک ہوا سے دل کو آتش زار بناتی
آئی لو برسات پھر آئی

ویرانوں میں آئیں بہاریں جنگل جنگل مور پکاریں!
دھرتی کے پیاسے ہونٹوں پر امرت کی پڑتی ہیں پھواریں
آئی لو برسات پھر آئی

کھیتوں پر آیا ہے جوبن ہر وادی مالن کا دامن
رنگ و بو کی ارزانی سے جنت در جنت ہر گلشن
آئی لو برسات پھر آئی

میخواری پھر عام ہوئی ہے توبہ غرقِ جام ہوئی ہے
آؤ، چلو میخانے جائیں وقت سے پہلے شام ہوئی ہے
آئی لو برسات پھر آئی

رم جھم رم جھم پانی برسے چھم چھم کرتی آجا گھر سے
آجا، آجا دید کو تیری آخر کوئی کب تک ترسے
آئی لو برسات پھر آئی

سلیمان اریب

کلام اسعد شاہجہانپوری

راہِ غم میں سرحدِ ناموس ہی تک ہم گئے
دل سے امڈے اشک اور آنکھوں میں آکر تھم گئے

یہ مرے دل کے شرارے پھونک دیں گے خشک و تر
شمع کے وہ سرد آنسو تھے کہ گر کر جم گئے

حسن کی نیرنگ سازی، اک طلسمِ راز ہے
ہم بھی اس کوچہ میں آئے اور نامحرم گئے

دل کا کوئی درد بھی امکانِ درماں تک نہ جائے
زندگی کی کوئی مشکل حدِ آساں تک نہ جائے

ضبطِ وحشت کس قدر مجبوریوں کا نام ہے
پاؤں صحرا تک نہ پہونچے، ہاتھ داماں تک نہ جائے

کوہکن اٹھا ہے جوئے خوں بہانے کے لئے
ہم ہیں اس کوشش میں کوئی اشک مژگاں تک نہ جائے

مطبوعات موصولہ

ستارے مجموعہ ہے سیدہ اختر کے ۲۰ مختصر افسانوں کا جسے رایل ایجوکیشنل بک ڈپو، دہلی نے شایع کیا ہے۔ سیدہ اختر ملک کی اُن چند خواتین میں سے ہیں جو ہندوستان کی نسوانی جماعت کی طرف سے سیاسی و ادبی نیابت کا پورا حق ادا کر رہی ہیں اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ ان خواتین میں بھی سیدہ اختر کا وجود بہت زیادہ نمایاں ہے۔

چونکہ وہ نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتی ہیں اور اسی کے ساتھ تقریر بھی بہت پرجوش و برمحل کر لیتی ہیں۔ اس لئے پرس اور پلیٹ فارم دونوں جگہ انھیں کافی شہرت حاصل ہے۔

اس مجموعہ کا آغاز خود انھیں کے دیباچہ سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ افسانہ نگاری کا مفہوم ان کے نزدیک کیا ہے اور وہ بحالات موجودہ کس قدر ضروری سمجھتی ہیں کہ افسانوں کے ذریعہ سے "مسایل حاضرہ" میں پبلک کی رہنمائی کیجائے چنانچہ اس مجموعہ کے تمام افسانے اسی خصوصیت کے حامل ہیں اور "خطیبۂ ہند" کے صحیح قومی درد اور ولولۂ اصلاح کی آئینہ دار ہیں۔ افسانوں کی زبان نہایت سادہ و سلیس ہے اور انداز بیان بہت دلکش۔ قیمت دو روپیہ چار آنے۔

زینت جناب قیسی رامپوری کا ناول ہے جسے رایل ایجوکیشنل بک ڈپو، دہلی نے شایع کیا ہے۔ اس کے قبل جناب قیسی کے متعدد ناول شایع ہو کر ملک سے داد حاصل کر چکے ہیں، لیکن اس ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ پلاٹ خود ان کا نہیں ہے بلکہ پبلشر کا بتایا ہوا ہے۔ اس طرح یہ ناول گویا فرمایشی چیز ہے، اور فرمایشی چیز اکثر بیشتر اچھی نہیں ہوا کرتی ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قیسی صاحب پلاٹ سے زیادہ خوش نہ تھے اور اسی لئے انھوں نے ابتدا میں ظاہر کر دیا ہے کہ اس کی ذمہ داری ان پر عاید نہیں ہوتی۔ بہرحال پلاٹ جیسا بھی ہو لیکن اس پس منظر پر نقاشی و رنگ آمیزی ایک مشاق آرٹسٹ کی ہے، اس لئے جس حد تک نقش اور اسکے اُبھار کا تعلق ہے، اسے اچھا ہونا ہی چاہیئے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

شیطان مجموعہ ہے جبران کے دس افسانوں کا جسے جناب اشعر دہلی نے عربی سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ جبران عربی زبان کا بڑا مشہور ادیب ہے اور اس کی تحریریں زیادہ تر "شعر منثور" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ عربی لٹریچر میں یہ رنگ زیادہ تر اُس اسکول سے تعلق رکھتا ہے جسے "شامی امریکن" اسکول کہتے ہیں۔ اس رنگ کی ابتدا سب سے پہلے امین ریحانی نے کی اور پھر جبران نے اس کو تکمیل کی حد تک پہونچایا۔

عربی ادب کا یہ جدید رنگ نہ بالکل افسانوی ہے، نہ محض خیالی، بلکہ اس میں افسانہ نگاری، مقالہ نویسی اور شاعری تینوں چیزیں ملی ہوئی ہیں، اور جبران اس نوع کی انشا میں کمال رکھتا ہے۔ یہ تمام افسانے یا مقالے لطیف جذبات عمیق خیالات، جدت تخیل اور ندرت بیان کے لحاظ سے دیکھنے کے قابل ہیں اور ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ فاضل مترجم نے اصل زبان کی کیفیات کو بڑی کامیابی کے ساتھ ترجمہ میں قایم رکھا ہے جو آسان بات نہ تھی ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

شہید ناموس جناب شاد عظیم آبادی کی مختصر سی مثنوی ہے، جس میں انھوں نے عرب کے ایک واقعہ حسن و عشق کو نظم کیا ہے۔

واقعہ بہت دلدوز ہے اور شاد صاحب نے اپنی زبان اور انداز بیان سے اور زیادہ جانگداز بنا دیا ہے۔ شاعرانہ خوبیاں بھی اس مثنوی میں پائی جاتی ہیں اور اگر کہیں کہیں کچھ جھول پایا جاتا ہے تو شاید صرف اس لئے شاد صاحب نے دوبارہ غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ طباعت و کتابت وغیرہ بہت نفیس ہے۔ قیمت بارہ آنے ——— ملنے کا پتہ :۔ اردو اکاڈیمی لاہور۔

مرگ پروانہ منظوم افسانہ ہے سیدہ اختر صاحبہ کا جس میں انھوں نے ایک نہایت دردانگیز واقعہ کو حد درجہ پر انداز میں پیش کیا ہے، سیدہ، ملک کی خواتین میں ادبی حیثیت سے خاص شہرت رکھتی ہیں، اسلئے مزید تعارف کی ضرورت نہیں۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ :۔ رایل ایجوکیشنل بک ڈپو دہلی۔

ذرات مجموعہ ہے ان مختصرات یا شذرات کا جن میں آنسہ محمودہ رضویہ نے اکابر قوم و ملت کی حالت اور بہت سے سماجی و اقتصادی و سیاسی حقایق پر اظہار خیال کیا ہے۔

آنسہ محمودہ ادبیات میں اس رنگ کی لکھنے والی ہیں جو زیادہ تر تخیل و رومان سے تعلق رکھتا ہے اور انکی متعدد تصانیف اس رنگ کی شایع ہو چکی ہیں، لیکن اس کتاب میں انھوں نے زیادہ تر حقایق سے بحث کی ہے اور سوسائٹی کے ان تمام پہلوؤں پر نقد کیا ہے جن کا مطالعہ ملک کی اجتماعی زندگی سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔

انداز بیان میں وہی ادبیت و ندرت ہے جو ان کی تمام دوسری تصانیف میں پائی جاتی ہے۔ ضخامت ۲۶۲ صفحات کتابت وغیرہ پسندیدہ، قیمت ۴ع۔ ملنے کا پتہ :۔ بشیر احمد اینڈ سنز اولڈ مارکیٹ کراچی ۲۔

سب کو روزگار ملے بی۔ بی۔ رندیوے کا لکھا ہوا رسالہ ہے جس میں انھوں نے موجودہ اقتصادی مسایل پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ جنگ کے بعد بے روزگاری کا سبب کیا ہے اور حکومت کی سامراجی پالیسی اور سرمایہ دارانہ نفع اندوزی نے ملک کو کتنا زبوں حال کر دیا ہے۔ رسالہ بڑے کام کا ہے اور نہایت مفید و ضروری معلومات پر مشتمل ہے۔ قیمت پانچ آنے ۔ ملنے کا پتہ :۔ قومی دارالاشاعت دائی، ام، سی، اے بلڈنگ مال، لاہور۔

موت کے غار اگست ۱۹۴۵ء میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کانوں کے مزدوروں کی پیرس میں منعقد ہوئی تھی جس میں مسٹر ڈانگے نے ایک رپورٹ پیش کی تھی، اور یہ رسالہ اسی کا ترجمہ ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ کانوں کے مزدوروں کی کیا حالت ہے اور ان سے کتنا وحشیانہ اور غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے۔

سرمایہ داری کے مظالم کی داستانیں یوں تو بہت ہیں لیکن ان مزدوروں کے حالات پڑھکر سخت عبرت ہوتی ہے اور دولت کا وہ مکروہ پہلو نہایت نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے، جس کو بدترین لعنت کہنا بھی اس کی صحیح تعریف نہیں، قیمت درج نہیں ہے۔ قومی دارالاشاعت۔ مال روڈ لاہور سے ملسکتا ہے۔

انڈونیشیا کی جنگ آزادی اختتام جنگ کے بعد جب بڑی قوموں اور غاصب ملکوں کی طرف سے محکوم قوموں پر پھر تسلط و حکومت کا سوال از سر نو پیدا ہوا، تو بہت سی قوموں نے

انقلاب کے آثار نمودار ہوئے اور انھیں میں سے ایک انڈونیشیا کی سرزمین تھی جو ہندوستان سے قریب ہے اور ڈچ کی مقبوضہ تھی - یہاں کی آبادی نے حکومت کے خلاف علم انقلاب بلند کیا اور اپنی آزادی کا مطالبہ کیا - اس رسالہ میں اسی جدوجہد کی داستان درج ہے - سید محمد صاحب کی تالیف ہے اور قومی دارالاشاعت لاہور سے دستیاب ہوسکتا ہے قیمت ۸ر

ایران کی بیداری موضوع نام سے ظاہر ہے - اس کے مولف جناب علی اشرف صاحب نے نہایت اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ بتایا ہے کہ مغرب کے اثرات یہاں کیونکر شروع ہوئے، انھوں نے کس کس طرح ایران کی آزادی کو نقصان پہونچایا اور روس و برطانیہ کی رقیبانہ پالیسی نے اس سرزمین کو کتنا تباہ کیا۔ اس وقت چونکہ ایران میں انقلاب پیدا ہے، اس لئے یہ کتاب بہت برمحل شایع ہوئی ہے بین الاقوامی سیاسیات سے دلچسپی لینے والوں کو اس کا مطالعہ ضروری ہے، کیونکہ ایران و ہندوستان پڑوسی ملک ہیں اور دونوں جگہ کی سیاسیات کا ایک دوسرے سے بہت تعلق ہے - علی اشرف صاحب نے بالکل تازہ واقعات و حالات کو سامنے رکھ کر یہ کتاب مرتب کی ہے اور اس لئے بہت زیادہ قابل توجہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- قومی دارالاشاعت مال روڈ لاہور -

غدر پارٹی کے انقلابی ۱۹۱۴ء و ۱۹۱۵ء کا زمانہ جب پنجاب میں سیاسی کارکنوں کو پھانسی دی گئی، ہندوستان کی انقلابی تحریک کا خاص زمانہ تھا۔ اس تحریک کے خاص بانی بابا موہن سنگھ تھے۔ اس پارٹی نے جو کچھ کیا اور اس کا جو نتیجہ ہوا، ان کو تفصیل کے ساتھ اس رسالہ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے کہ اس میں شہداء وطن کے جدوجہد کی داستان بیان کی گئی ہے بہت زیادہ قابل قدر ہے، جسکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی ابتدا کس جانفروشانہ جذبہ سے ہوئی تھی اور اس نے کس طرح آہستہ آہستہ منظم صورت اختیار کی۔ اسکے مصنف رندھیر سنگھ ہیں۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ :- قومی دارالاشاعت۔ مال روڈ۔ لاہور

بھگت سنگھ اور انکے ساتھی ہندوستان کے انقلابیوں میں بھگت سنگھ کو خاص اہمیت حاصل ہے اس رسالہ میں ان کے اور ان کے ساتھیوں کے حالات، مقدمہ کی کارروائی اور نتیجہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان شیدایان وطن نے کتنی تکالیف برداشت کیں اور وہ سخت سے سخت منزل میں بھی کسقدر ثابت قدم رہے۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ :- قومی دارالاشاعت مال روڈ۔ لاہور۔

اشتراکی سماج ترجمہ ہے ہولٹ جانس کی کتاب کا جسے محمد کلیم اللہ صاحب نے کیا ہے۔ اس رسالہ میں روس کے اشتراکی نظام پر نہایت دیانت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوویٹ آبادی کس اطمینان و مسرت کی زندگی بسر کر رہی ہے اور وہاں کی حکومت پر جو الزامات قایم کئے جاتے ہیں وہ کس قدر غلط ہیں۔ کتاب نہایت دلچسپ ہے اور پڑھنے کے قابل۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ قومی دارالاشاعت مال روڈ۔ لاہور۔

مارکسزم کیا ہے ایل برنس کا ترجمہ ہے جسے محمد کلیم اللہ صاحب نے اُردو میں کیا ہے۔ مارکس کا فلسفہ آج کل بیحث ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس پر بحث کی جارہی ہے۔ یہ کتاب مارکس کی کسی تصنیف کا اقتباس نہیں بلکہ مارکسی تحریک کا انتقادی تجزیہ ہے جس میں سرمایہ داری، اور طبقۂ عمال کی آویزش کے اسباب بیان کرتے ہوئے مستقبل کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے۔ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ:- قومی دارالاشاعت مال روڈ لاہور

بچکولے ناول ہے جناب رئیس احمد جعفری کا جسے ہندوستانی پبلشرز دہلی نے شایع کیا ہے۔ جناب جعفری ادب و

صحافت کی دنیا میں کافی عزت و شہرت رکھتے ہیں اور اس سے قبل ان کی جتنی تصانیف شایع ہوچکی ہیں خواہ وہ ادب و انشا سے تعلق رکھتی ہوں یا تذکرہ و سیرت نگاری سے، ارباب نظر نے انھیں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

برہنگی

یہ ناول جیسا کہ خود انھوں نے دیباچہ میں ظاہر کیا ہے ہارڈی کے ناول "میراث کیٹریرج" کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے اور انسان کی کمزور فطرت سے جو نتائج پیدا ہوسکتے ہیں ان کو نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔ قیمت ۴ ہے

جناب ناظر نے اس کتاب میں موجودہ مغرب کے ان تمام خیالات و اصول کو یکجا کر دیا ہے جو تحریک "برہنگی" کے متعلق پیش کئے جاتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد یہ تحریک سب سے پہلے جرمنی میں شروع ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ وہ تمام یورپ میں پھیل گئی یہاں تک کہ اب ایک اچھی خاصی جماعت ہر ملک میں اس تحریک کی حامی نظر آتی ہے۔

اس کتاب میں اس تحریک کے نہ صرف آغاز و ترقی کی داستان بیان کی گئی ہے، بلکہ حفظان صحت کے لحاظ سے جو کچھ اس باب میں کہا جاتا ہے، اسے بھی پیش کر دیا ہے۔ اُردو میں اس موضوع پر یہ بالکل پہلی کتاب ہے جو متعدد تصاویر کی وجہ سے اور زیادہ دلکش ہوگئی ہے۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد (دکن)

قمر

ناول ہے خواجہ محمد شفیع دہلوی کا لکھا ہوا جسے ہندوستانی پبلشرز دہلی نے شایع کیا ہے۔ خواجہ صاحب کہنہ مشق انشا پرداز ہیں اور دلی کی ٹکسالی زبان کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ناول دراصل اچھا خاصہ طنز ہے ہماری معاشرت و سیاست پر جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ہاں عورتوں کی تعلیم کیونکر رفتہ رفتہ انھیں سوسائٹی کی ملکیت بناتی جارہی ہیں اور ہمارے گھر کس طرح اُجڑتے جارہے ہیں، ناول بہت دلچسپ ہے اور ہر لحاظ سے مطالعہ کے قابل۔ قیمت عہ

نکہت گل

دیوان ہے جناب وفا براہی کا جسے پستک بھنڈار لہریا سرائے پٹنہ نے شایع کیا ہے۔

محمود عالم صاحب صوبۂ بہار کے ایک معزز خاندان کے رُکن ہیں، وفا تخلص کرتے ہیں اور حضرت نوح ناروی کے شاگرد ہیں۔

ہر غزل کی اخیر میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ وہ کس مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ جناب وفا نہ صرف صوبۂ بہار بلکہ ہندوستان کے اور بہت سے شہروں کے مشاعرہ میں شرکت کر چکے ہیں۔ ان کے کلام میں انکے اُستاد کا رنگ بہت کم پایا جاتا ہے، لیکن جتنا بھی ہے، خوب ہے۔ کلام بظاہر بے عیب معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی بڑی بات ہے۔ قیمت عہ

شیطان

ناول ہے جناب قیسی رامپوری کا لکھا ہوا۔ قیسی صاحب بڑے مشاق اہل قلم ہیں اور پلاٹ، تکنک، زبان اور انداز بیان ہر حیثیت سے وہ ایک کامیاب ناول نگار سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک خصوصیت اُن کے ناولوں اور افسانوں میں یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کے مطالعہ کے بعد انسان کسی نہ کسی مفید نتیجہ تک ضرور پہونچتا ہے اور اس طرح نہ ان کی ادبیت بیکار جاتی ہے، نہ پڑھنے والے کا وقت۔ کتابت طباعت کی طرف بھی بہت توجہ کی گئی ہے۔

قیمت تین روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ:۔ ہندوستانی پبلشرز، دہلی۔

تن درستی اور دل کشی

اِن کا دار و مدار صاف خون پر ہی

برسات میں بھی خون کا صاف اور

قوی رہنا ضروری ہی

موسم کی تبدیلی کے وقت اور بہار، گرمی اور برسات میں اِنسان کو سینکڑوں بیماریوں سے واسطہ پڑتا ہے مثلاً فسادِ خون، خارش، پھوڑے پھنسیاں، داد، اور وبائی امراض وغیرہ۔ یہ بیماریاں روکی جاسکتی ہیں، اگر آپ محتاط ہوں اور صحیح تدابیر اختیار کریں۔

خواہ کچھ بھی ہو۔ آپ کا خون زہریلے مادوں سے ہمیشہ صاف رہنا چاہیے۔ خون ہی پر صحت و زندگی کا دار مدار ہے۔ اگر آپ کا خون صاف اور تن درست ہے تو موسم کی کوئی تکلیف آپ کو لاحق نہیں ہو سکتی۔ آپ آسانی کے ساتھ صافی کا استعمال شروع کر سکتے ہیں۔ "صافی" خون کے زہریلے مادوں کو نامعلوم طریقوں پر خارج کر دیتی ہے اور خون کو قوت دیتی ہے اور انسان کو چست و چالاک بناتی ہے۔ بچے، بچے، عورت اور مرد سب استعمال کرتے ہیں۔

خون صاف کرنے کی

صافی

قدرتی دوا

برسات آگئی ہے۔ امراض و وباؤں سے بچنے کے لیے بطور حفظ ماتقدم صافی کا استعمال آپ کے لیے ضروری ہے

فوٹ:- اب ہمدرد مرہم بلا روک ٹوک آپ کو مل سکتا ہے۔ جلد کی تمام تکالیف کے کام آتا ہے ایک ڈبیہ خرید لیجیے اور گھر میں رکھیے۔

ہمدرد دواخانہ، دہلی

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:

۱ — چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲ — مادئین کا مذہب

۳ — حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جسکے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و ننگ نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جلد دوم اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور انکا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے زبان پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً:- مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

قیمت حصۂ اول للعہ، حصۂ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء

(مصحفی نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
حیات مصحفی۔ اردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء

(تظیر نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
نظیر کا مسلک شاعری پر تبصرہ نظیر اور عوام انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء

یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے۔ یعنی اسوقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔

قیمت تین روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۲ء

اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری ۴۱ء میں شایع ہوا تھا

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء

اس نمبر میں مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

ترخانہ اجرات اشتہار

ایک سال چھ ماہ تین ماہ ایک ماہ

ایک صفحہ ۲۰ روپیہ ۱۲ روپیہ ۷ روپیہ ۲ روپیہ

آدھا صفحہ ۱۲ روپیہ ۷ روپیہ ۴ روپیہ ۱ روپیہ

چوتھائی صفحہ ۷ روپیہ ۴ روپیہ ۲ روپیہ ۱ روپیہ

جنوری سنہ ۴۴ء

(جدید شاعری نمبر)

اس میں بتایا گیا ہے کہ جدید رجحانات شعری کی کیا حقیقت ہے اور آزاد نظم نگاری کا وزن و قافیہ سے بے نیاز ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۵ء

(قرآن نمبر)

اس میں ڈاکٹر ٹسڈل کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں حضرت نیاز کے فٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ

شش شاہی جاری نہیں ہو سکتا

سالانہ بیرون ہند دس روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا۔

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات

اور قواعد طلب کیجئے

جواب کے لئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے